

غالب برانہ مان



ریاض صدیقی

غالب برانہ مان

ریاض صدیقی

اسری پبلی کیشنز کراچی

اتساب

ڈاکٹر وزیر آغا
کے نام

مجلہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	غالب بھرانہ مان
سن اشاعت	جولائی ۱۹۹۲ء
طبعات: ڈین پرنٹنگ پریس ناظم آباد سہر 2 کراچی۔	
قیمت	۶۰ روپے

-----○ ملنے کی پتے ○-----

- مکتبہ ہم زبان ایف ۲/۸۳ مارٹن کوارٹرز، جہانگیر روڈ کراچی ۷۴۸۰۰
- مکتبہ فکر و خیال ۱۷۲ سٹیج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور ۱۸
- پنجاب بک ہاؤس اردو بازار کراچی
- بینکن ہنس۔ گل گشت کالونی ملتان

ترتیب

حروفِ تعارف (ادارہ)

- ۱۔ غالب نامہ ۱۱
- ۲۔ اُردو کی ادبی نشر اور غالب ۲۸
- ۳۔ غالب کے طرفدار ۳۸
- ۴۔ غالب شکن ۴۰
- ۵۔ غالب کے دریاں ۷۳
- ۶۔ وستنبو ۷۸
- ۷۔ ضخیمہ (وستنبو کا اُردو متن) ۸۳

حرف تعارف

تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نظر سے غالب پر بہت کام ہوا ہے لیکن پھر بھی کم ہے۔ زیر میں آسمان، غالب کے موضوع پر ریاض صدیقی کے چند مقالہ کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات میں مصنف کا تنقیدی رویہ رواجمی تنقید کے عری ریشے سے ذرا مختلف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے پہلی بار غالب کی نثر نگاری کو موضوع بنایا ہے اس پر پہلے بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ریاض صدیقی کا انداز نظر اور ان کے عناصر ان مجموعی تحریروں سے مختلف ہیں۔ ان کے خیال میں بڑی ادبی نثر کا اولین ہیر و غالب ہیں۔ بنیادی طور پر اس مجموعے میں شاعری کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ زیر میں آسمان کے مصنف نے اس حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے پیش نظر ہیں۔

میر، نظیر، غالب، اقبال اور فیض اردو کی بڑی شاعری کے عناصر خمسہ ہیں۔ ان میں سے غالب اور فیض کو یہ برتری بھی حاصل ہے کہ انہوں نے بڑی ادبی نثر لکھی ہے۔ اہل نظر کی اس فہرست کو نظر انداز کر کے کوئی عہد اپنی تاریخی و تہذیبی عظمت کو برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ یہ کہکشاں مقام کے اعتبار سے برصغیر کے آفاق پر چمکتی ہے لیکن کرۂ ارض کے ہر کونے سے اس کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ فضا اور تہذیب دکھائی دیتا ہے جس کی ماہیت اور اثر پذیری عالمگیر ہے۔ یہ بین الاقوامی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اقبال کے سوا باقی چاروں بڑے اہل نظر کا موضوع انسان ہے جو مذہبی ثقافتی نسلی اور ملاقاتی تفریق سے بالاتر ہے۔ انسان دوستی اور انسان نوازی کا جو رویہ ان شاعروں کے یہاں ملتا ہے وہ امریکی فلسفی ولیم جیمز کے فلسفہ

انسان دوستی یعنی "ہیومنیزم" سے کوئی ملالت نہیں رکھتا ہے۔

غالب پر پچھلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ! اس سوال کا جواب فیضِ مفت نے کہا بڑے ادب اور بڑے ادیب کے لئے ضروری ہے کہ ہر نئے اور اور ہر اس وقتے میں جو بڑی تبدیلیوں سے گزر چکا ہو فن اور افکار و نظریات کی ازمیر و تعبیر و تشریح کی جاتی ہے مغرب میں بڑے کلاسیکی شاعروں اور ادیبوں پر اب بھی باقاعدگی سے کتابیں آرہی ہیں، ہمارے یہاں عظیم شاعر و شاعر نگار غالب پر غالب صدی ۱۹۶۹ء تک تحقیقی و تنقیدی کام ہوتا رہا لیکن شرح و مقدار کے اعتبار سے یہ کام اقبال کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ حکومت نے اقبال کی سرپرستی کے لئے بڑے اور مضبوط ادارے قائم کئے۔ مذہبی پیشواؤں نے ان کی ملاوٹ خفی کے باوجود ان کی شاعری کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا اہل سیاست نے اقتدار تک رسائی کے لئے ان کا استعمال کیا اور معتبر مورخوں نے بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا سلوک روا رکھا۔ مرزا غالب یہاں اس قسم کی سرپرستی سے محروم ہے سنہ ۱۹۶۶ء کے بعد سرکاری حکمت عملی کی ناکامی و ملن پرستی اور نظریہ لٹریچر کے نتیجے میں ملاقاتی ٹٹا فتنوں ریلوں اور قوم پرستانہ جذبات کا ابال شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان جذبات نے تنکیم کی صورت اختیار کر لی۔ اس صورت حال کا اثر کم سے کم ملن و ادبی قلم و پر مرتب نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ علماء اور اہل نظر و ملت آگہی سے مالا مال اور انتہائی حساس طبقہ ہوتا ہے۔ وہ منفی رویہ میں بہنے کے بجائے صحیح خطوط پر ان کی تنظیم و ترتیب کرتا ہے تاکہ قومی شیرازہ بکھر نہ پائے اور سوچنے والے ذہن بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔ چنانچہ یہاں بدقسمتی سے علماء اور اہل نظر منفی تحریکات سے اختلاف کرنے کے بجائے اس کے ہواؤ میں بیٹے گئے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسا جدید اہل قلم جن کی پرہش سرسید اور حالی اسکول کی گود میں ہوئی اپنی عمر کے آخری حصے میں حالی سے گریباں دکھائی دیا۔ ان حالات ہی کے نتیجے میں غالب جیسا شاعر و شاعر نگار ہمارے لئے اجنبی اور غیر ملکی

بن گیا۔

زیر نظر مجموعے میں انیس ناگی اور ڈاکٹر ملک حسن اختر کے حوالوں کا ذکر اکثر آیا ہے اس سلسلے میں مصنف نے بتایا کہ پچھلے دس سالوں میں غالب سے اختلاف کرنے والوں میں ان دو فاضل نقادوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اختلاف اگر علمی و فکری اور تنقیدی اصولوں کی پیروی میں ہو تو ہنایت محرم عمل کہا جائے گا لیکن جب یہ عمل ذاتی معاملات اور عزیز منردی واقعات کی کیچنے تان پر اسٹائی جائے تو اس کو کم سے کم بچ کی جدید دنیا میں مہذب انداز نظر سمجھنا زیادتی ہوگا۔ انیس ناگی اور ملک حسن اختر نے علمی و فکری ہنج سے ہٹ کر ذاتی اور عزیز منردی واقعات کو موضوع بنایا ہے ان کا مطلع نظر میں ایک شخصیت اور اس کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں ایسی حوالے سے ان حضرات کا ذکر چلا ہے۔ اس کو غالب کی طرف داری نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ مضمون و فحاح سمجھنا چاہئے انگریزی ادب میں اختلافی موضوعات پر اس قسم کی دفاعی تحریریں ملتی ہیں جن کو اب کلاسکس کا درجہ حاصل ہے اردو میں ایسی تحریروں کا رواج کم رہا ہے۔

اس مجموعے میں غالب شکن دیگانہ اور غالب از عبدالرحمن بھٹوری کا خصوصی تنقیدی مطالعہ بھی شامل ہے ریاض صدیقی کہتے ہیں کہ ۔

انیس ناگی اور اختر صاحبان سے بہت پہلے غالب شکنی اور غالب کی قصیدہ خوانی کی گئی تھی یہ سبھی ایک جذباتی رد عمل تھا۔ ان دونوں دستاویزات کا تنقیدی نقطہ نظر سے کوئی مائثرہ اب تک قلمبند نہیں کیا گیا چنانچہ اس موضوع کو خاص طور پر مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔

مجموعے کے محقق ریاض صدیقی برصغیر کے جلنے پھیلنے نقادوں میں ہیں۔

اردو کی جدید سائنس تنقید میں ان کا مجموعی کام کسی بھی معروف نقاد سے کم نہیں ہے انہوں نے حالیہ و تازہ عصری مسائل اور دلچسپ گروہی موجود صورت حال

کو جن تفصیل کے ساتھ موضوع بنایا ہے قابل توجہ ہے۔ پہلے یہاں کی ثقافتی صورت حال، تعلیمی نصاب کی بے معنویت، ذرائع ابلاغ کے کردار، مذہبی شیوروں کی غلط رہنمائی اور تاریخ نویسی کے متغی رجحانات پر انہوں نے اپنے تنقیدی مضمونوں میں بحث کی ہے جدید لسانی فلسفے اور فلسفہ سائنس پر بھی ان کو بڑا حاصل ہے تاریخ اور تاریخی شعور ان کی ادبی تحریروں میں خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے تاریخی نقطہ کے بارے میں انہوں نے تاریخ کے سائنسی نظریہ سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ میں فرد کے بدلے سماجی و تہذیبی اور اقتصادی و سیاسی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ تاریخیت کے بارے میں شکاگو اسکول اور امریکی نیوکریٹسم کے نقطہ نظر کو انہوں نے رد کیا ہے۔ انیسویں کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جرأت گفتار و اندویشی اختلافات کے اظہار کو معزز مقام نہیں دیا گیا ہے

اور اس قسم کے لوگوں کو بڑے اعتماد کے ساتھ متنازعہ کہا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے جدید کے مقابلے ہماری سطح کس قدر پست ہے۔ ریاض صدیقی کو اسی لئے معروف علمی و ادبی حلقے بالشرادیب و نقد اور ادبی رسائل نظر انداز کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ وہ حلقہ جس سے ان کی دیرینہ وابستگی ہے ان کے زبان نظر آتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر خرمیش نے اپنی تازہ تاریخی کتاب میں سے ترقی پسندیت سے اختلافات کا اظہار کرنے والوں کو جگہ دی ہے لیکن اپنے ہی فائدان کے سینٹر سرگرم کارکن کا نام تک نہیں دیا ہے۔

ریاض صدیقی کے نقطہ نظر سے اختلاف و امتزاج کا حق ہر لکھنے والے کو ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ ادارہ ان کا مجموعہ اس لئے شائع کرنا ہو کہ ان کے نقطہ نظر سے اتفاق ہے۔ ادارہ کا مطلع نظر صرف یہ ہے کہ کسی بھی ادیب کے شعور علمی و ادبی کام کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا جائے۔ ہم اسی جذبے کے ساتھ یہ مجموعہ شائع کر رہے ہیں جو اردو کی ادبی تنقید میں ایک اضافہ ہوگا۔

غالب نامہ

اشعار ہوں صدی عیسوی برصغیر کے لئے آگ و خون کی صدی تھی فرمانروائے
 کشور ہند وستان عالمگیر کی بے مثال جہاں بانی دجہاں ذاتی کا یہ بیقر ہو اگر مختلف
 فرقوں اور طبقات میں باہمی نفرتوں کا لاد ا لند ہے اندر جمع ہوتا رہا۔ اس صورت
 کی پرورش اشعار ہوں صدی کے بعض راسخ العقیدہ مذہبی بشوواؤں کے
 پاتھوں ہوئی جن پر آسمان سے عالم خواب میں حکم رہی نازل ہوتے تھے۔ وحدت
 الوجود کے مسک کی پیروی کرنے والے بزرگانِ دین عالمگیر کی نظر میں جو راسخ العقیدہ
 مذہبی بشوواؤں کا سوہرست بھی تھا دائرہ اسلام سے خارج اور واجب القتل
 تھے چنانچہ برصغیر کو بے راہ روی سے بھانے کے لئے شہزادے نے اپنے حقیقی چچا
 اور وارث تخت و تاج دارا شکوہ کا صرف سر ہی قلم نہیں کر دیا بلکہ اس
 کی لاش دہلی کے چور لہے پر لٹکا دی گئی تاکہ طاقت و ہیبت عوام کے ذہنوں
 پر مسلط ہو۔ اورنگ زیب اوداس کے صاحبِ بصیرت مشیر اس نفرت اور
 غش سے بے خبر تھے جو ہر طرف سلگ رہی تھی۔ ان حالات ہی کا کرشمہ
 متحاکر اس کے مرتلے ہی بغل اقتدار بقول ایس ٹی سنو لے یوں بکھر گیا جیسے
 تاش کے پتے بکھر گئے ہوں۔ فرمانروائے ہند کی ذہانت اور سیاسی بصیرت کا
 اعجاز تو اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ برصغیر میں تحولات کے پھانے آنے والے
 انگریزوں کو اس نے قطعی نظر انداز کیا جن دنوں وہ ملتان کا گورنر تھا۔ انگریز
 مستند اور دوسرے علاقوں سے خولے کی بھاری مقدار انگلستان بھیج رہے تھے

نکار وہاں بارود ساز صنعت دھماکہ پیدا کرنے والے ہتھیار بنائے۔ گجرات کی گورنری
 میں عالمگیر نے اس تجارت پر پابندی ضرور عائد کی اور صحیح اندازہ لگایا
 کہ اس طرح برصغیر میں مغل اقتدار کو خطرات پیدا ہو جائیں گے لیکن جب
 وہ سندھ میں گورنری کر آیا تو یہ پابندی ختم کر دی اور ان تمام مراعات کو
 جاری رکھا جو شاہجہاں کے حکمناموں کی بناء پر انگریز تاجروں کو حاصل تھیں
 وہ اپنی علیحدہ فوج بنا سکتے تھے اپنے علاقوں کا انتظام کر سکتے تھے حتیٰ کہ بارشمال
 نافذ کرنے کا بھی اختیار رکھتے تھے بلدیاتی ادارے بنا سکتے تھے اور اپنے سب
 ٹیکس مال میں ڈھالنے کی رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے گویا عہد عالمگیر میں
 میں برصغیر کی بساط پر انگریزی مہر سے اپنی شاطر چال چل رہے تھے اور نگ
 ڈیمپ کے بعد یہ بارود جو لندہ رہی اندر سلگ رہا تھا دھماکہ کے ساتھ پھٹ پڑا
 مرہٹوں اور جاٹوں نے دہلی اور اس کے اطراف میں گہرام مچایا جس سے نہایت
 کھلے اس عہد کے عظیم صوفی دانشور شاہ ولی اللہ دہلوی کو اسی میں بہترین
 محسوس ہوئی کہ افغانستان کے حیرت مند لیڈر نادر شاہ کو کفار کی مکر توڑنے
 اور مسلم اقتدار کو بچانے کی دعوت دی جلتے تانبے کی یہ سب سے اہم اور
 فیصلہ کن غلطی تھی جو ہمارے بزرگ سے سرزد ہوئی اور نادر شاہ نے برصغیر
 میں مسلم اقتدار کی مکر توڑ کر رکھ دی۔ ان حالات میں شاہ عالم کے پاس کوئی
 راستہ اس کے سامنے تھا جسے نہیں کہ وہ جنگال کو انگریزوں کے حوالے کر دے کیونکہ
 ۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کی ان فوجوں نے جو مغل حکمرانوں کے
 رعایت حاصل کر کے انہوں نے تیار کی تھی ایک مسلم فدار کی مدد سے سرساج الدولہ
 کا فاتحہ کر دیا تھا۔ اس طرح انگلستان کے تاج برطانیہ کا خواب بھر مندہ تعبیر ہوا
 اور برصغیر ان کی ”ورلڈ مپائر“ کے منصوبے کی تکمیل کا سبب بنا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی
 اب مغل اقتدار کی جگہ لے چکی تھی اور کمپنی بہادر کا حکم نامہ جاری ہو گیا تھا۔ اسی
 صدی کا فرما ندرائے ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا جس کو قلعہ

معلیٰ کی حدود سے باہر کسی بھی چیز پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس دور میں عموماً امرائے وشرقا انگریزوں کے نمک خوار و وفادار تھے اور اکثر مشرقا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں سے وابستہ ہو گئے تھے اسی پر آشوب اور غیر یقینی دور میں جہاں قانون، سکھ اور انتظامیہ و عدلیہ انگریزوں کے قبضے میں تھے یہ مقام اگر ۱۷۹۷ء میں مرزا غالب نے جنم لیا تھا۔ ان کا نام مرزا اسد اللہ خان تھا اور یہی نام خود غالب نے ۱۸۳۷ء کی ان عرضیوں پر لکھا جو پنشن کے سلسلے میں دی گئی تھی۔ والد عبداللہ بیگ سلجوقی ترک تھے۔ آبائی پیشہ سپاہ گری تھا وہ مہاراجہ انھو کے یہاں ملازم تھے اور کسی لڑائی میں ملے گئے تھے اس طرح وہ عمر کے بہت ابتدائی دنوں میں والد کے سائے سے محروم ہوئے اور چچا نصر اللہ بیگ نے ان کی کفالت کا ذمہ لیا۔ جو کہ قلاب احمد بخش کی بہن کے شوہر تھے ان کی تحویل میں انگریزی سرکار کی دی ہوئی فیروز پور جیل اور مہاراجہ بہنادر سنگھ کی دی ہوئی لواحہ ڈی جلیگر میں تھیں ان کے چچا لارڈ ٹیک کی سرکار میں چار سو سواروں کے افسر تھے ابھی غالب کی عمر زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ لارڈ ٹیک نے جاگیر دیتے ہوئے قلاب احمد بخش پر یہ مشروط عائد کی تھی کہ وہ نصر اللہ بیگ کے لواحقین کی کفالت کرتے رہیں گے اس پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے آباء اجداد سرکارِ انگریز کے خدمتگار تھے لیکن اس خدمتگاری کا طعنہ غالب کو کیونکر دیا جاسکتا ہے جیسا کہ انیس ناگ نے لکھا ہے کہ ان کے چچا اور والد بھائی کے سپاہی تھے۔ اس جملے کی ساخت کے پس پشت لکھنے والے کی نیت ظاہر ہوتی ہے اس طنز میں حقارت آمیز رویہ صاف جھلکتا ہے ان دنوں کی انتقبادی اور سیاسی صورت حال نے اکثر لوگوں کو انگریزوں کی خدمتگاری پر مجبور کیا۔ چنانچہ سیاسی اور اقتصادی

لے شیخ اکرام داک نام نے اسد اللہ بیگ اور عالی دہرخی نے اسد اللہ خان لکھا ہے۔

مجبوریوں کو محالہ بنا کر انگریز پرستی کے الزامات عائد کرنا اور ان الزامات کے ساتھ اپنی نازیبا زبان استعمال کرنا عالمانہ شان و اعزاز کو داغدار کرتی ہیں اللہ! میں غالب نے امر و جان کی زنجیر پہن لی یہ رشتہ ظاہر ہے کہ ان کی مرضی پر نہیں ہوا تھا ۱۸۴۲ء میں وہ آگرہ چھوڑ کر وطن آئے اس وقت وہ ایک محوم شخص تھے جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا مہاجر اور پیشی کا حق حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بہت کچھ کیا مگر ناکام رہے۔ اس کے لئے انہوں نے انگریز حکام کے دروازے کٹکٹا کٹائے ان کی شان میں تصدیق لکھے اور ان کو خوشامد القاب و آداب سے مخاطب کیا کہ یہی طریقہ رائج تھا ہمارے معتمد و فاضلے انیس ناگی اور ملک حسن اختر نے ان واقعات کا سہارا لے کر جس طرح غالب کی کردار کشی کی ہے انہوں نے اس طرح عمل ہے دور حاضر کے ایسے دانشور و فاضل علماء کو جو آج بھی اپنی خزانہ و آواز حکومت ہیں، آپ کا تابعدار (Your Most Obedient Servant اور مودبانہ عرض Most Respectfully) وغیرہ جیسے فقرے لکھنے پر مجبور ہیں اس قسم کا انداز نظر زیب نہیں دیتا ہے ان حضرات کو اچھی طرح علم ہے کہ برطانوی محل سرکس سرکاری و جاگیرداری روایات کا جو ڈھانچہ ہمیں سونپ گئی ہے اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے اس قسم کے معتمد ضمیمہ جیویرے صدی کے ان عظیم ذہنوں پر کیوں تنقید نہیں کرتے ہیں جو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے ملک گیر جہد میں انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے تھے یہی نہیں بلکہ غالب کی گھریلو زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے فاضل نقاد اور عسکر کے یگانہ غالب شکن لکھتے ہیں کہ تاہم غالب کی مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ کوئی خاتون خانہ اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی، جو اکھینا گھر میں شراب کشید کرنا اور دوستوں کے ساتھ گپ بازی کی طویل نشستیں.....

غالب کی تعلیم کے بارے میں مستند معلومات کا فقدان ہے لیکن ان کے

شاعری اور مجموعی تحریریں گواہ ہیں کہ وہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور انگریزی زبان سے ان کی شناسائی معمولی سی ہو مگر شعلیؒ البتہ یہ راز صرف ڈاکٹر ملک حسن اختر کو معلوم ہے کہ انہوں نے دستیاب کئے عبادت سے عربی الفاظ صرف اس لئے نکال دیئے تھے کہ اگر یہ انہیں مسلمان نہ سمجھو بیٹھیں، صرف و نحو، منطق و فلسفہ اور نجوم و تارخ جیسے موضوعات پر بھی ان کی دسترس کے واضح ثبوت ملتے ہیں علمی موضوعات پر یقیناً ان کو ایسی قدرت حاصل تھی جس کا مقابلہ معاصر علما سے نہیں کیا جاسکتا ہے غالب کے سوانح نگاروں نے ان کے ایک استاد شیخ معظم کا ذکر کیا ہے جبکہ حالی نے عبید اللہ کا نام لکھا ہے لیکن مرزا کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجربہ اوردیوانہ ہی ان کا استاد تھا و شیخ عالم سے ہٹ کر چلنا ان کا شعار تھا اور ایک ایسے شہرے ہوئے دولتی معاشرے میں جب شاعر کے لئے استاد کی شرط تھی ان کلبے استاد رہنا اسی شعار کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان پر انیسویں صدی کے وہایت پرستوں کی بے جا تنقید میں بے استاد ہونے کا طعنہ بھی شامل تھا۔ مرزا شعور کی بہت ابتدائی دور ہی میں مشکل پسندی کا شوق انہیں کہیں سے کہیں لے گیا اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد علمی و ادبی روایات سے لاتعلقی تھے اور انہیں ذوق شعر و ادب ورثے میں نہیں ملا تھا۔ مشکل پسندی کے اس عمل میں بھی ان کی ذہانت ان کے ذوق متناہد اور جستجوئے حقیقت کی کوشش کا فرما تھی۔ بیدل کا فلسفیانہ انداز ان کو پسند آیا اور اس کی مشکل پسندی کو انہوں نے فن شاعری سمجھا ہی وجہ ہے کہ پیروی بیدل میں وہ ہمل شعر کہتے تھے میران کے پہلے نقاد تھے جنہوں نے ان کے کلام میں موجزن شعلگی (sparkling) کو محسوس کرتے ہوئے

لے غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف کے لئے ڈیڑھ ہزار مالانہ کی رقم سفر کی گئی تھی۔

کہلے یا تو یہ بہت بڑا شاعر ہو گا یا پھر اول فول بجے گا۔ طرز بیدل میں شعر گوئی کی
مشق یاس نہ آئی اور خود انہوں نے محسوس کیا کہ ۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ حناں قیام ہے

خود تنقیدی اور خود احتسابی کا یہ عمل ان کو سیدھے راستے پر لے آیا گیا ان کا
شعور ہی ان کا مصلح ثابت ہوا۔ یہ فرد کی ایک ایسی خوبی ہے جس سے اب ہمارے
اہل نظر تہیں دامان نظر آتے ہیں اور صاف ستھری ادبی و علمی تنقید بھی انہیں
وعداوت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جس ذوق و شوق کے ساتھ انہوں نے بیدل سے
ذہنی و شہتی جوڑا تھا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس کو خیر باد بھی کہا چنانچہ انہوں
نے ایک اپنا منفرد اسلوب اور رنگ پیدا کر لیا۔ اُردو کلام کا جو انتخاب انہوں
نے ۱۸۶۹ء میں کیا تھا اس میں طرز بیدل کے چند نمونے لیے گئے تھے اس لئے
ہیں کہ وہ چالاک تھے جیسا کہ ڈاکٹر حسن اختر کا خیال ہے بلکہ اس لئے کہ یہ
نمونہ دوسروں تک پہنچ سکے اس کی وضاحت وہ ایک مراسلے میں کر گئے ہیں
اور اس سے ان کے ذوق نقد کا بھی اعلا نہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا عہد
تمام نئی و سائنسی اصول تنقید سے یکسر نا آشنا تھا۔ ان حقائق کے حوالے سے منفی
انداز نظر رکھنے والے پڑھا فاکہ بھی بنا سکتے ہیں جیسا کہ ملک حسن اختر اور انیس
ناگی نے بنایا ہے غالب نے کسی قسم کے طرز فکر کا گلہ کرتے ہوئے کہا ہے ۔

”اب آہر دئے شیوہ اہل نظر گئی“

غالب نے نہ تو گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر شاعری کی اور نہ دربار سے
مغل آرائیاں ان کے لئے تخلیق کا محرک بنیں بلکہ یہ مشق سیاسی و سماجی اور
اقتصادی زندگی کے ساتھ جاری رہی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور
نثر میں انیسویں صدی کی روح اور زندگی سمٹ آئی ایک مثنیٰ ہوتی روایت اور
تہذیب کا احساس ابھرا اور ایک نئی آنے والی دنیا کا شعور پیدا ہوا یہی وجہ
ہے کہ طوفان آمد آمدِ فصلِ بہار کا وہ ذکر کرتے ہیں اور گرمی نشاطِ تصور انہیں

نعرہ سرانی پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ اس صدی کے نقیب تھے جس میں اب ہم زندگی بسر کر رہے ہیں چنانچہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ آٹھ دہائی صدی کے لئے ستارہ واقع مندرجہ گلشن نا آفریدہ تھے۔ دہلی میں مورخہ اقبال کی دورہ ہری چلن سے ان کا ٹکڑا ہوا کیونکہ وہ خود کو حویلیوں محل سراؤں اور نانا مقاموں کے خول میں بند نہیں رکھ سکے۔ ایک طرف اردو کی کلاسیکی شعری روایت اور مغل ثقافت گرد و پیش کے مجموعی عوامل سے لاقول چراغ آخر شب کی طرح سبھرک رہی تھی اور قلند شاہی کے اندر حضور شاہ میں شعر و سخن کی آندائیں جاری تھیں تو دوسری طرف سماجی و اقتصادی انقلاب انگریز برصغیر کے مسلم تہذیب و سیاست کے پورے جسم میں کینسر کی طرح پھیل چکی تھی۔ روایات و اقوال، اخلاقیات اور علم و ادب کے فلک بوس محل میں گرد آؤ رہی تھی اور معاشرتی و سیاسی اور تہذیبی خدو خال نئے رنگ و روپ میں اس پہلے کے اندر سے اُبھر رہے تھے امر اور رُسا اور علما کا وہ طبقہ جس کے لئے ذوق جیسے سطلی شاعر کا استاد شاہ ہونا ہی اعزاز تھا اور جو صدیوں کی تہذیبی و روحانی افیون میں مست اس یقین پر تکیہ کئے بیٹھا تھا کہ جو کچھ جیسا ہے ایسا ہی ہے گا ایک خول میں بند زندگی گزار رہا تھا۔ غالب اکیلا شاعر تھا جس نے موخواب معاصرین کو جو فکری کی کوشش کی تبدیلی اور ارتقاء کے سائنسی اصولوں کو شعوری طور پر قبول کیا اور اپنی اس جدت و نوازی کے عوض معاصر اساتذہ و علما کا اختلاف مول لیا۔ آخری یادگار معاصر سے جس اساتذہ نے اپنا کلام سنایا اس میں نہ تو کسی تبدیلی کا ذکر ملتا ہے اور نہ ہی کسی — تشویش کا کوئی اشارہ لیکن اس ابھرنے میں وہ تنہا شاعر تھا جس نے لطیف اشاراتی پیرائے میں بادشاہ وقت اور ان کے قبیحہ خواہوں کا لفظ سنایا لیکن یہ اشعار اساتذہ اور سامعین کے مژن سے گزر گئے۔ اس مغل میں بھی جو کہ اپنوں کی تھی غائب کو وہ مقام نہ ملے سکا جس کے وہ مستحق تھے چنانچہ اگر لاش صاحب کے درباروں میں ان کی

نشت آخری میں رکھی گئی تو انہیں ناگی کو کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ لیکن انہوں نے بڑی شان سے یہ شکایت کی ہے جس کے ذریعے وہ دور حاضر کے قارئین کو غالب کی ناقدری اور بے حرمتی سے روشناس کروانا چاہتے ہیں۔ گویا قدر شناسی اور عزت و تکریم کا معیار ان کے لئے سنا ہی دوبارہ انگریزوں کے دربار اور استاد ذوق ہیں بالکل اسی طرح جیسے آج کل صحافی قسم کے شاعروں اور نقادوں کے لئے سکاہم سدا کا دمی ادبیات پاکستان ہے انہیں ناگی لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب انہیں گورنر جنرل کے دربار میں آخری قطار میں نشست ملی تو غالب کو بے پایاں رنج ہوا: ... غالب اپنی بیماری اور نا طاقتی کے باوجود اس غرض سے دربار میں گئے تھے کہ ان سے ترجمہ سکو کیا جائے گا لیکن ان کا یہ سہم لٹ گیا اور انہیں دربار میں آخری نشست پر جگہ دی گئی۔

غالب کا قیام اگرچہ اس اعتبار سے مفید تھا کہ وہاں زندگی کی ساری کمائییں اور لواہی مٹھاٹھ ہاٹ حاصل تھے ایک ایسا شخص جس کے آباؤ اجداد طبیعت خاص سے وابستہ تھے ہوں اور جس نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی ہو یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ماضی کے خاندانی ورثے سے یکسر منہ موڑنے میں صیغ نہ ہوگا بھی وجہ ہے کہ اقبال پرچیت پر ناناں تھے انہیں ناگی نے جدید لغتیات کے اصول، تحلیل نفسی کے سامنے حربے غالب پر استعمل کرتے ہوئے ان کے ذاتی معاملات کو موضوع بنایا ہے اور ان کی محرمیوں اور محبوبیوں کا مذاق اڑا کر ان کے مجموعی کردار کو بُری طرح مسخ کر دیا ہے۔ یہ کسی ایک فرد کی نہیں انیسویں صدی کے عہد و محکوم انسانوں کی بے حرمتی بھی کہیں جاسکتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "عامی قرض دار کی لغتیات عام آدمی کی نسبت مختلف ہوتی ہے جھوٹ تعلق اور وعدہ خلافی اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتے ہیں۔ غالب کی شخصیت میں ان خصوصیات سے شاید متبراً نہیں تھی۔ غالب کے عزیز و اقارب

سب جھوٹا بنا کا شکار تھے اگر بحیثیت فرد واحد غالب ان کمزوریوں کا بخود تھے تو کم سے کم ہمیں اپنے گریبان میں مزید جھانک لینا چاہیے کیونکہ ہماری توپوری قوم قرض کے جال میں جکڑی ہوئی ہے اور باناریں مغرب کی اشیائے صرف سے سبھری ہوئی ہیں گویا پوری قوم کی نفسیات عادی قرض خواہ کی نفسیات بن چکی ہے وہ جھوٹی اتنا کا شکار ہے اور پدیرم سلطان بود ہمارے تقریباً تمام علما اور مورخوں کا مسلک ہے جن کی وجہ سے پوری قوم پدیرم سلطان بود کے نقشے میں سرشار ہے۔

غالب نے قیام دہلی کے دوران دو ایسی دنیاؤں کا مشاہدہ کیا جو کسی بھی سرے پر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتی تھیں۔ یہاں ایک قلعہ معلوے امراء، شرفاء، کلاسیکی دیانت کے پرستار تھے تو دوسری طرف انگریز، انگریزوں کا دہلی کالج، انگریز ریڈیڈنٹ کادفر ڈپٹی کمشنری اور مغل تہذیب کے سپاہِ اختی پر انگریزی تہذیب، جمہوریت، طرز تعلیم اور سائنس ایجادات کی جھلکیاں تھیں۔ یہیں ایک دنیا ان کی اپنی تھی جس سے وہ سانس تھے کیونکہ اسی کی گودی میں انہوں نے پرورش پائی تھی اس میں صدیوں کے سفر نے کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا کی تھی دوسری دنیا بہت نئی اور اجنبی بلکہ طلسم ہوش رہا تھی وہ آزادی و جمہوریت اور طرز انتظام و تجارت کے وہ تقورات لائی تھی جس سے ہر صغیر کے لوگ لاعلم تھے اس کے جلو میں علوم و فنون اور سائنس کا وہ سرمایہ تھا جس نے لوگوں میں حیرت انگیز بھان کو جنم دیا مسلم نفسیات کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے ہر نئی روایت نئی ایجاد اور نئے منظر کو اپنی روایت و اقدار اور عقائد و افکار کے خلاف سازش سمجھا اور اس کے خلاف مسلح تقادم کے حکمت عملی سے کام لیا یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں یہ وہم و بآلی طرح عام ہو گیا کہ انگریزی زبان و تہذیب اور سائنس و جمہوریت کا مقصد مسلمانوں کو طاقت کے ذریعے عیسائی بنانا ہے۔

غالب کی بد قسمتی تھی کہ جب انہوں نے ان دو دنیاؤں کے درمیان سفر شروع کیا تو حالات نے کچھ اس طرح پٹا کھنکھایا کہ سکون و آسائش کے پہلے دن ختم ہو گئے بغتہ عالی نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا یہاں تک کہ صبح سے شام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ

ہم نے یہ مانا کہ دکن میں رہیں کھائیں گے کیا ایسی صورت حال میں جس قسم کی جھنجھلاہٹ اور لگتا ہٹ پیدا ہو رہی ہے اعصابی خلل واقع ہوتے ہیں حیات و کائنات کی طرف سے نسرار کا جو رویہ ابھر رہا ہے ان کے یہاں دور دور تک نظر نہیں آتا ہے اپنے عہد کے ماگیزڈ اور شرنا کی طرح نہ تو وہ گھبراہٹ میں سے چھٹے ہے اور نہ ہی صبر و قناعت کی پناہ گاہ میں چھپ کر امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ان کا یہ دعویٰ ہے

مشکلیں اتنی بڑی ہیں بھدیر کہ آساں ہو گئیں

بہت صحیح ہے۔ وہ بڑے حوصلے آہنی عزم دارانے اور برداشت کے مالک تھے۔ گردش روزگار جہاں لے گئی وہ گئے اپنی جائز اقتصاد سے ضروریات کی تکمیل کے لئے وہ آخر تک کمر بستہ رہے چنانچہ پنشن کے لئے جو صبر آزمائی جنگ انہوں نے لڑی لنگے دور میں کوئی اور راہ نہیں سکتا تھا اس جدوجہد کی حرمت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ساری زندگی آبلہ پائی کے باوجود انہیں آخر تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے زندگی کے مجموعی المیوں کا مقابلہ اپنی زندہ دلی، احباب، لوازمی، وضع واری اور شوخی و ظرافت اور خوش طبعی اور خوش اخلاقی سے کیا اس اعتبار سے ان کا کردار مثالی اور اعلیٰ تھا۔ ان کے یہاں یہ گمانہ کی طرح منفی رد عمل اور اتالیبندی یا اذیت کوئی رجحان پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہر حال میں کھٹے ہی رہے۔ اختلاف کے تیر ہو سنے والوں کو دگر دہکتے رہے اور زندگی

کی رنگارنگی سے دلکھت اندوز ہوئے۔ زندہ رہنے اور زندگی کو مثبت انداز سے
 سمجھنے کی خواہش ۱۸۷۱ء نے ان کی قوت ارادی کو ماند نہیں پڑنے
 دیا۔ عقیدہ پرستی اور تقدیر پرستی (Fundamentalism and
 Fatalism) کو انہوں نے رد کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو پچاس روپیہ ماہانہ پر تائینج ٹوپی
 کا فرض سونپا لیکن وہ اس کام کو اچھوڑ کر قرآن و حدیث سے دستبردار ہو گئے
 کیونکہ برصغیر کے حکمران امراء اور مشرفان تائینج کے جس اسلوب کو پسند کرتے تھے
 غالب جیسا جینٹلمن عالم اور نقاد اس پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ انگریزوں کی
 صحبت دہلی سوسائٹی کے ماحول دہلی کالج کے اثرات اور کہنی سے بالبطون
 نے ان کو انگریزی زبان و تہذیب اور جمہوری انداز نظر سے مایوس کر دیا تھا۔
 چنانچہ جیب انہوں نے اس نظام فکر کا موازنہ برصغیر میں رائج صدیوں پر لکھے
 نظام فکر سے کیا تو ان کی نظر انتخاب اول الذکر کے حق میں رہی اگر پدم
 سلطان بودہ ان کا مسلک ہوتا تو یقیناً وہ آخر الذکر کی حمایت کرتے۔ ۱۸۴۷ء
 میں دہلی سوسائٹی نے ان کو اپنا رکن بنایا۔ یہاں انہوں نے کولڈ اسٹریم کے
 خدمت میں پیش کیا جانے والا سپاسنامہ بھی لکھا ۱۸۴۷ء دہلی کالج کے
 پروفیسری کا ان کو موقع ملا لیکن بعض نامعلوم وجوہات کی بناء پر وہ اس
 موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ انیس ناگی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے
 ان کا قیاس ہے انہوں نے برصغیر کے بہت بڑے شاعر کا مطالعہ بھی اور
 ذاتی حوالوں سے کیا ہے اور اس کے لئے گھر بیٹھ مسائل، بیوی سے تعلقات
 قرض کے معاملات پنشن کے لئے ٹنگ و دو اس سلسلے میں سرکار برطانیہ کو
 لکھے جانے والے خطوں کے وہ جملے جن میں انگریزوں کیلئے خوشامدائد کلمات
 ادا کئے گئے ہیں اور اسی قسم کے مسائل کا انتخاب کیا ہے یہاں تک کہ انکی
 جنسی زندگی اور نظریات کو بھی موضوع بنالیا ہے ان کا خیال ہے کہ غالب

آزاد جنس کے قائل تھے اگر واقعی یہ بات صحیح ہے تو اس سے ان کی انتہائی بصیرت و بصارت اور جرأت پسندی کا پتہ چلتا۔ لیکن فاضل نقاد اس فقرے کی مدد سے ان کی فحاشی و پراگندگی کا جو تاثر دینا چاہتے ہیں سراسر غلط ہے۔ برصغیر کے ان شرفاء و امراء کی نجی زندگی جن کو اعلیٰ اخلاق و اقدار کا نمونہ سمجھا جاتا تھا بدترین بے راہ روی اور پراگندگی کا نمونہ تھی اور آج بھی کم سے کم جہلے یہاں صورتحال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

دور حاضر کے بہترین جدید نقاد ہونے کی حیثیت سے انیس ناگی نے اس حقیقت کا ذکر کرنا ہی گوارا نہیں کیا کہ غالب اپنے عہد کا پہلا زرخیز ذہن تھا جس نے انگریزی تہذیب اور جمہوری انداز نظر کی سہولتی و نئی روشنی کو خوش آمدید کہا اور قیاسی علوم کے مقابلے میں سائنس کی صلاح سرائی کی یہی وجہ ہے کہ وہ فکری جدیدیت جس کو بیسویں صدی میں قبول عام کا شرف حاصل ہوا ان کے یہاں ۱۸۵۷ء کے بعد ایک نظر بہ حیات کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ حقیقت پسندی، مادیت، سماجی شعور و مقصدیت کے ساتھ ساتھ تنقیدی فکر کے معاملے میں بھی ان کا انداز نظر زیادہ سائنس اور تجرباتی تھا چنانچہ انہوں نے سودا اور ناسخ کی اصلاح زبان کو بطور ناموزن قبول کرنے کے بجائے "لفظ الحوام" کے حصول کی پذیرائی کی اور لفظ نمبر کو مانع الوقت حواس تلفظ کے مطابق "لمبر" لکھا۔ اس طرح زبان کے بارے میں انہوں نے ایک ایسے نقطہ نظر کی طرف پیش قدمی کی جو بیسویں صدی کے مغرب میں سائنسی اثرات کے تحت فروغ پایا یعنی کہ زبان سماجی عمل (Social Function) ہے اس نقطہ نظر کے دلیل ان کے اردو خطوط ہیں جو انہوں نے ۱۸۵۷ء سے لکھنے شروع کئے۔ ان خطوط کے بارے میں ناگی کو شکایت ہے کہ یہاں انہوں نے اپنی نجی زندگی معاشقے اور اپنے ازدواجی حالات کو پردہ اخفا میں رکھا حالانکہ یہ بھی ان کے کردار کی عظمت ہے کہ انہوں نے ذاتی معاملات خاص پر سماجی و تہذیبی او

علمی و فکری معاملات کو فوقیت دی۔ یہ شکایت کہ ۱۸۶۹ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک
 حال اور آؤاد کے سوا کسی نے غالب کی تحقیر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ایک بے جا
 بات ہے۔ انہوں نے غالب کے مقابلے میں ان کی کس ایسے معاصر کا ذکر نہیں کیا
 جس کی داو و تحقیر اس دور میں کی جاتی رہی ہو۔ ان کی علمی و ادبی تصنیفات
 کی تعداد اور اخباروں میں شائع ہونے والا کلام اس سقیقت کا ثبوت ہے کہ
 وہ اپنے دور کے انتہائی اہم آدمی تھے۔ ان کے خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ مداحوں
 اور قدردانوں کا ایک سلسلہ موجود تھا۔ ان کے معاصر سائنہ کے خطوط کا کوئی
 سراغ آج تک نہیں مل سکا ہے قصیدہ گوئی اور اہل علم و تشکر کے کلمات کو انہوں
 نے اپنے مضامین اور خطوط کا حصہ نہیں بنایا کیونکہ بقول ان کے یہ تحریریں اقتصاد
 ضروریات کی تکمیل کے لئے کبھی گنتی تھیں اور انیسویں صدی میں اس قسم کی
 تحریریں اقتصاد و حیلے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی
 میں کپیتی کے انگریز تاجر بھی مغلوں اور حکمرانوں کی اسی طرح قصیدہ خوانی
 کرتے تھے لیکن یہ کہنا کہ وہ مسلم حکمرانوں اور امریکہ کا تھیر بردار اور ایجنٹ تھے
 لغو بات ہوگی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے انکار و نظریات سے ان کے تعلق کسے
 کوئی سند تو نہیں ملتی ہے لیکن مومن اور فضل حق خیر آبادی سے گہرے مراسم اس
 اثر پذیر کے امکان کا جواز بن سکتے ہیں۔ فضل حق خیر آبادی کا ایسا گہرا تعلق
 کسی ایسے آدمی سے کیونکہ ہو سکتا تھا جو انگریزوں کا تنگ خور اور قصیدہ خواں
 ہو۔ انگریزوں نے تو غالب کو بہادر شاہ ظفر کا سگے لکھنے اور ان کی وفاداری
 کا مورد الزام بھی سمجھا یا تھا۔

غالب کی زندگی کا بنیادی مسئلہ حصول معاش تھا کیونکہ ان کی زندگی کا
 بہت بڑا حصہ قرض اور کرانے کے گھروں پر گزرا۔ انیس ناگی ان کے قرض کی رقم
 تیس ہزار بتاتے ہیں جو کہ آج کل کی شرح کے رو سے کم و بیش لاکھوں ہوتے
 ہیں انیسویں صدی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مقدار صحیح نظر نہیں آتی ہے حصول

معاش کے لئے انہوں نے سرکارِ برطانیہ کے دفاتروں کا دروازہ کھٹکھٹایا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شاہی دیوان میں اس کے لئے درخواست گزاری احمقانہ بات ہوتی کیونکہ بادشاہ خود کپنی کے وظیفے پر زندگی گزار رہے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں انہوں نے اس مقصد کے لئے رفت و سفر باندھا تھا ان دنوں انہیں مبلغ پندرہ سو روپے ماہانہ بطور پیشین مل رہے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں سرکارِ انگریزی سے براہ راست رابطہ کرنے کے لئے انہوں نے کلکتہ کی طرف کوچ کیا اور راستے میں مکھنوا، ہاندہ، کانپور اور بنارس کے مقامات پر قیام کیا۔ بنارس کے دیو مالائی حسن اور ہندو فلسفہ جمالیات پر مبنی تہذیب نے ان کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ کلکتہ میں ان کی ملاقات سرولیم فریئر سے ہوئی۔ چیف سکریٹری اینڈ ریو اسٹر انگلینڈ ان کی قدر و منزلت کی کچھ تمام تر کوشش کے باوجود ان کو کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہ اتفاق تھا کہ ان کے تینوں انگریز ہمدر دیاتو سرگئے یا معزول ہو گئے اور ہاکنس نے بقول ملک حسن اختر ان کے خلاف رپورٹ لکھ کر بنایا کام بگاڑ دیا۔ اس ناکامی کے بعد بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے اور ۱۸۳۶ء میں کاغذات لندن روانہ کئے لیکن ۱۸۳۲ء میں یہاں سے بھی ان کے خلاف فیصلہ صادر ہوا جس کے خلاف اسی سال انہوں نے کلکتہ میں اپیل دائر کی۔ ۱۸۳۶ء میں جو درخواست انہوں نے جمع کرائی تھی وہ انگریزی میں لکھی گئی تھی اور اس پر ان کی مہر او دستخط ثبت تھے۔ ۱۸۵۹ء میں بھی انہوں نے فحش کے اجراء کے لئے کوشش کی لیکن ناکام ہوئے۔

کلکتہ کا سفر غالب کی زندگی اور ان کے ذہنی ارتقا میں سنگ میل ثابت ہوا یہاں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی اور پہلی بار انہوں نے بہت قریب سے انگریزی تہذیب اور ماحول کو دیکھا۔ خواتین کی آزادی اور مرد و زن کے درمیان مساوات کا تصور ان کے لئے بہت خوش کن تھا انیس ناکی کا قیاس

ہے کہ یہاں ان کا تعلق فرسی میں تحریک سے رہا۔ اس قیاسی انگشتات کے بلے میں حیرت ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "غالب نحاس تاریخی عمل کا مشاہدہ کرنے کے پہلے زمانہ فرنگ کے جمال سے لطف اٹھایا حقیقت اس کے برعکس ہے لکھتے ہیں انہوں نے جدید ذیلی سے پہلا براہ راست رابطہ قائم کیا۔ سرسید کے نام سے منسوب فارسی مثنوی میں جن دفاعی جہازوں کا ذکر ہوا ہے وہ گنگا جمن میں نہیں بلکہ ہنگلی میں چلتے تھے اسی شہر میں ان کا مقابلہ فارسی کے معروف استاد شاعر قتیل سے ہوا۔ غالب کو اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر ناز تھا اور وہ خسرو اور سعدی کے لہجہ کو مستند تصور کرتے تھے۔ ان دنوں قتیل کا ستارہ سورج پر تھا اور ان کے گرو مداحوں اور مصرع اٹھانے والوں کا ایکہجوم موجود تھا لکھتے ہیں غالب کو اس ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ قتیل کے سرسبز مداحوں اور مصرع اٹھانے والوں نے ان کو بہت ستایا چنانچہ انہوں نے مثنوی باد مخالف کہی۔ اس ادبی معرکے میں بھی میدان ان ہی کے ہاتھ رہا کیونکہ ہرات کے سفیر نے ان کی فارسی دانی کا برسرِ مغل امتحان کیا ان حقائق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دورِ حاضر کے غالب شکن فرماتے ہیں کہ ان کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور ذرا سے امتحان سے ان کی آٹا اتنی مجروح ہوئی کہ یہ واقعہ ان کا جنون بن گیا۔

مئی ۱۸۵۷ء سے عام ہے چینی کا آغاز ہوا اور کچھ مہا در کی فوجوں نے اس اجنبی سرزمین کی طرف چٹیں قدمی کی تاکہ فرمانرِ شاہ ہندوستان کے سر سے تلخ آثارِ ملکہ برطانیہ کے سر پر رکھا جاسکے کیونکہ اب انگریزوں کے نزدیک بہادر شاہ ظفر کا مصنوعی وجود کھد بے معنی ہو چکا تھا اور برصغیر اس منزل پر تھا جہاں برطانیہ کی براہ راست حکومت ضروری ہو گئی تھی۔ اہم مئی ۱۸۵۷ء کو جیسا کہ غالب کے ایک خط سے منکشف ہوتا ہے میرٹھ ہنگامہ آفاقی کامرک بنا اور جنگ آزادی شروع ہو گئی جنگ کا یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا اور

غالب اس پورے عرصہ میں گھر کے اندر ہی بند رہے۔ احباب نواذی اور محفل آرائی کے تمام سلسلے ٹوٹ چکے تھے چنانچہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف ان کا شغل ٹھہرا انہوں نے بہان قاطع پر نظر ڈالی اور جنگ آزادی کے حالات قلمبند کئے۔

غالب کا عہد بڑے کلاسیکی اساتذہ کا زمانہ تھا ان کے معاصرین میں بہادر شاہ ظفر، ذوق، مومن، مہربانی اور شیفتہ وغیرہ جیسے معزز شعراء تھے ذوق جمالی دہلی کے شاعر ہونے کے باوجود اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے کیونکہ وہ بادشاہ کے استاد تھے چنانچہ مملاتی سازش کا رنگ ان کے مزاج میں درج پس گیا تھا غالب جیسے بڑے شاعر اور نقاد سے پیشہ ورا نہ رقابت کی بنا پر ان کا ٹکڑاؤ تھا لیکن غالب کے مذاہن اور شاگردوں کا ایک حلقہ بھی موجود تھا ان میں مالی اور مر سید بھی شامل تھے۔ ان کا ایک انگریز شاگرد الکزنڈر عین عالم جوانی میں مر گیا تھا اس کا دیوان مطبع احمدی آگرہ نے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا تھا وہ ایک آزاد خیال عقل پسند اور حقیقت میں صوفی مسلمان تھا۔

غالب کردار کے اعتبار سے بن اور علمی و ادبی اعتبار سے جامع شخصیت کے مالک تھے جس کا واضح ثبوت وہ تصنیفات ہیں جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔

دیوان اردو طبع اول ۱۹۵۱ء رسید المطابع دہلی دوسری بار ۱۸۴۰ء

تیسری بار ۱۸۶۲ء چوتھی بار ۱۸۶۳ء

دیوان نازس طبع اول ۱۸۴۵ء دارالسلام دہلی

پنج آہنگ طبع ثانی ۱۸۴۹ء

مثنوی بہادر شاہ ۱۸۵۳ء

مہریم روز طبع اول ۱۸۵۵ء فخر المطابع دہلی

دستجو طبع اول ۱۸۶۲ء مفید اطالع آگرہ دوسری بار ۱۸۸۶ء

دوسری سوانح شہر ملی۔

لکھنؤ میں مسلمان ہو گیا تھا۔

۱۸۶۳ء	نیکشور مکھنو	قانع برہان
۱۸۶۳ء	"	کلیات نظم فارسی
۱۸۶۳ء	محبس پریس دہلی دوسری بار ۱۸۶۵ء	قادر نامہ غالب
	مطبع محسوری دہلی	
۱۸۶۳ء	اکمل المطابع دہلی	مثنوی ابرگھڑ طبع اول
۱۸۶۳ء	"	اسمائے فارسی
۱۸۶۳ء	اکمل المطابع دہلی	سوالات مجدد الکرم
۱۸۶۳ء	"	لطائف غیبی
۱۸۶۵ء	"	نامہ غالب
۱۸۶۵ء	اکمل المطابع دہلی	ورقش کاویانی
۱۸۶۷ء	"	رقعات غالب (فارسی)
۱۸۶۷ء	اکمل المطابع دہلی	شیخ تیز
۱۸۶۷ء	مطبع دہلی	سید حسین
۱۸۶۷ء	نیکشور مکھنو	کلیات نثر فارسی
۱۸۶۸ء	مطبع ممبئی میرٹھ	عود ہندی (اردو)
۱۸۶۹ء	"	اردوئے معلی (اردو)

اُردو کی ادبی نثر اور غالب

اُردو میں ادبی نثر کا مسئلہ زبان کے مسئلے سے وابستہ ہے لیکن ہمارے فاضل معترف نقادوں اور محقق دانشوروں نے جدید مغرب کے لسانی فلسفے اور لسانی سائنس سے اب تک استفادہ نہیں کیا ہے۔ علم سہانیات (Semantics) ساختیات (Structuralism) اور اسلوبیات (Stylistics) اُردو کی ادبی دھانے میں موجود نہیں ہیں۔ چند لکھنے والوں نے اس کی طرف پیش قدمی کی کوشش ضرور کی لیکن انہوں نے ان نظریات کو ”ادب برائے ادب“ کے مردہ جسم میں نئی روح ڈالنے کے لئے بطور میڈیا استعمال کیا ہے۔ نئے ترقی پسند نقاد اگر وہ بند یوں اوّ معافیتوں کے چکر میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان کی اپنی علمی و ادبی سطح بہت گر گئی ہے ان میں بعضوں کا مطالعہ بہت عام اور سرسری ہے۔

اُردو کی ادبی نثر کا سفر ۱۸۸۲ء میں ان دنوں شروع ہوا جب ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے میرامن کو باغ و بہار لکھنے کی ترغیب دی۔ ادبی مورخوں نے اُردو نثر کی ابتدا کو ۱۳۹۵ھ سے منسوب کیا ہے جب حضرت گیسو دراز نے رسالہ معراج العاشقین لکھا تھا۔ یہ اُردو کی اولین عوامی نثر ہے کہ نیک مصنف نے اس میں عوامی بول چال کی زبان لکھی تھی اپنی ہیئت ساخت اور طبع میں یہ نثر بہت مختلف ہے لیکن ادب کے مورخوں نے تاریخ سے رشتہ جوڑے لکھنے کی خاطر اس کا ذکر کیا ہے۔ لسانی سائنس کے حوالے سے اس پر کوئی تجزیاتی کام نہیں ہوا۔ دعویٰ بھی کیا گیا کہ ابتدائی اُردو نثر کا پہلا نمونہ اشرف جہانگیر کا کوئی رسالہ

ہے لیکن ڈاکٹر ابوالیث مدنی نے اس کے لئے اب تک کہنی سند پیش نہیں کی ہے یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اولین تحریر شیخ معین الدین گنج العلم کی ہے لیکن یہ تحریر بھی دستیاب نہ ہو سکی جس میں ذکر کیا ہے ان دونوں اہل اللہ اور بزرگان تقویٰ برصغیر کے مختلف ملاؤں میں سرگرم کار تھے اس بڑی عوامی قوت کا مسلم حکمرانوں اور اس کے امراء سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ان کا وجود اور مختلف علاقوں میں پھیلاؤ محکموں اور امراء کے سیاسی و اقتصادی مفادات اور لسانی نظریے کے لئے دہر قاتل کا درجہ رکھتا تھا۔ اس قوت نے اپنے افکار و نظریات کو پسماندہ عوام تک پہنچانے کے لئے شاعری اور نثر کے میڈیا کو منتخب کیا اور ایک ایسے زبان سے روشنی چڑھے جو عام لوگ بولتے تھے علماء اور مؤرخین کے یہ دعوے کہ اہل اللہ اور بزرگان تقویٰ کا مقصد محض اخلاقی تبلیغ تھا بالکل غلط ہیں۔ ان کے مسلک میں اقتصادی و سیاسی اور لسانی و ثقافتی نقطہ نظر موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے محکموں کے اقتصادی و سیاسی اور ثقافتی و لسانی نظام کو مسترد کیا۔ اس عہد کے شعر و ادب کو جو عوامی زبان میں لکھا گیا سرکار و دربار کی طرف سے نہ تو اشیر و مواصلت تھی اور نہ تحفظ چنانچہ یہ کہنا کہ نہ جلنے کتنا قیمتی شعری ادبی سرمایہ بنام و نشان ہوا ہو گا حق بجانب ہے۔ جو تھوڑا بہت بخشی ندی کی تہوں سے میل گیا مولوی عبدالحق نے سمیٹ لیا اور جو کچھ دوسری ندریں میں پہہ گیا ہو گا اس کا کوئی حساب نہیں اس کے علاوہ بہت کچھ سرکاری گمشدہ ہوئے مغلقات ہوں پر چھاپے ہو کر قبضہ میں لے لیا ہو گا۔ اس دور کی دوسری تحریریں میں جن کے حوالے آتے ہیں ”رسالہ شرح مرئب القلوب“ ۱۲۹۶ھ ”رسالہ کلمۃ الوفا“ ۱۲۸۶ھ اور ”رسالہ احکام الصلوٰۃ“ ۱۲۹۶ھ وغیرہ ہیں۔

اردو کی اولین ادبی نشر ملا وجہی کی داستان سب رس ہے جو ۱۲۳۵ھ میں لکھی گئی یہ داستان اگرچہ دکنی سلطان کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اور اس کی کہانی کا مقامی حوالوں سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر اس زمانے کی عام زبان اور لہجے کے

نوتے اس میں ملتے ہیں لیکن اس کا سبب فارسی زبہ قسم کا اردو سے دکنی
 حکمرانوں کا اختلاف تھا اس کو آسانی کے ساتھ اردو نشر کی پہلی ادبی کتاب کہا
 جاسکتا ہے عام اردو میں لکھی جانے والی نشر کا جو سلسلہ چھ دھویں صدی عیسوی
 سے شروع ہوا تھا سترہویں صدی کے ابتدائی دور میں ختم ہو گیا اور اپنے پیچھے
 بہت تھوڑے سے حوالے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اردو شاعری اور نشر نگاری سے
 شاہی درباروں اور امراء و شرفاء کی ڈیڑھویں تک محدود ہو گئی جہاں اس نے
 فارسی اخراجات کو سمیٹنا شروع کیا اس حلقے سے تعلق رکھنے والوں نے جب روایتی
 فارسی زبان اور شعر و ادب سے عام بول چال کی زبان میں لکھی گئی شاعری کا موازنہ
 کیا تو آخر الذکر انہیں متبذل بازار میں اور پھر محسوس ہوئی یہ ان عوام کا سرمایہ ہوتا
 جو تعداد کے اعتبار سے بہت بڑی اکثریت میں ہونے کے باوجود ہر قسم کے حقوق
 اور رعایات سے اردوئے قاذون محروم تھے امراء و شرفاء ان کو زبلی کہتے اور بدبخت
 جیسے لفظوں سے لوازتے تھے۔ اردو کی نئی ادبی نشر امراء و شرفاء اور درباروں میں
 بنائی گئی۔ اس کے اسلوب اور لفظیات کے مفہوم سمیلنے و جمع کرنے کے بعد
 کہتا: اس کا اولین نمونہ ہے جو فضلی کے ذریعہ بیان کا نتیجہ تھی اور زمانہ تحریر
 ۱۶۷۵ء تھا اس نشر کا ڈھانچہ اسلوب ادبیان فارسی کے اخراجات میں ڈھلا ہوا
 تھا اور نقل و سجع ٹیکنگ اس پر عادی تھی اسی زمانے میں سودا نے اپنے دیوان
 پر دیباچہ لکھا۔ اس نئی بیانیہ ٹیکنگ میں اولین جامع اور مکمل تصنیف مرادطی
 حسین تھیں کی داستان نو طرز مرصع ہے اسٹار دیں صدی عیسوی سے اس اسلوب
 نے رونق پایا اور یہی سترہویں اور اسیویں صدی میں فقیر محمد گویا و جب
 علی بیگ مرور، غلام الم فہید، منشی غلام خوش بے خیر، غلام علی کسٹونی، امیر مینائی
 مرید احمد خان اور دوسرے اساتذہ نے اس رنگ کو خوب پروان چڑھایا۔ اردو
 کی تمام ادبی داستانیں اسی زبان میں لکھی گئی۔

اسیویں صدی شروع ہوتے ہی نور شاہ لیم کالج میں شعبہ ہندوستانی کے عمل

ٹی اکڑ گئی کراٹھسٹن نے سب سے پہلے اُردو کی اس ادبی منظر کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا بد قسمتی دیکھتے کر اُردو زبان اور شعر و ادب کو بنانے سنا لینے کا کام کسی ہندوستانی کے ہاتھوں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ایک انگریز کے ہاتھوں انجام پایا جس کی مادری زبان اُردو نہیں تھی ہر چند کہ اس صورتحال کے پیچھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفادات کام کر رہے تھے تاہم بلا واسطہ ہی اس کا فائدہ اُردو زبان کے حصے میں گیا انہوں نے اُردو کے بہترین اساتذہ کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا اور ان کو سادہ و بے ادب زبان میں کتابیں لکھنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں سے بارخ و بہار، گنج خوبی، بارخ اُردو، آرائش مہفل تذکرہ گلشن ہند، طوطا کہانی قصبہ لیلیٰ مجنوں، تاریخ مادری، گلزار دانش، گل مغریت اور قصبہ گل بکاولی وغیرہ جیسی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اس نہرست میں "بارخ و بہار" ایسی کلاسک ثابت ہوئی جو اب تک خواہ کیا ہے یہ اُردو کی پہلی بلکہ آخری کتاب ہے جس کو عام لوگوں میں مقبولیت کا اعزاز ملا۔ آج بھی اس کے عوامی نسخے شہروں کی دکانوں اور کتابوں کے شیلیوں پر بکتے ہوئے نظر آتے ہیں گئے اس وقت تک اُردو کی ایسی کوئی ادبی کتاب موجود نہیں ہے جو اس شان سے بازار میں بیک رہی ہو۔ مکھنڈ والوں کو فورٹ ولیم کالج اور میرامن کی یہ بغاوت بہت کھلی چٹا پنچر کلاسیکی طرز کی مروجہ عبارت آرائی کو ان مضامین بھر مشر پسندوں سے بھانے لکھنے کے لئے مکھنڈ والوں میں ایک جذبہ بیدار ہوا اور بہت سے اساتذہ ہتھیار بند ہو کر میدان میں آگئے انیسویں صدی میں ان اساتذہ نے نہ چلنے کتنی داستانیں لکھو ڈالیں اس نہرست میں نمایاں نام مرزا حبیب علی بیگ سرور کا تھا۔ اسی مؤرخ ردِ عمل کی فضا میں انشاء اللہ خداں انشاء صرنا اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرنے کے لئے رانی کیتلی جیسی کہانی لکھی جس میں انہوں نے عربی اور فارسی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں کیا اُردو نثر میں یہی پہلی ادبی کتاب ہے جو اپنی ہی سرزمین کے قصبے کو موضوع بناتی

ہے۔ اردو کے ادبی نقادوں نے انسانی کامیابیوں، تحقیق والوں اور مورخوں نے اس تناظر میں رانی کیسکی پر کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔

فورٹ ولیم اور انشا کے بعد ادبی نشر میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب شاہ میں مرزا غالب نے اردو میں خطوط لکھنا شروع کئے۔ اس سے پہلے دہلی کالج نے اردو نشر نگاری کی روایت کو یقیناً بہت کچھ دیا تھا مگر اس کا دائرہ علم انصاف سے آگے نہ بڑھ سکا۔ غالب کو شروع میں اندازہ نہ تھا کہ وہ جس انداز سے ادبی نشر لکھ رہے ہیں وہ معیار و معنی اور سماجی و تاریخی حوالوں سے بڑی ادبی نشر کا منصب حاصل کرے گی گویا اردو کی بڑی ادبی نشر کا سنگ میل غالب ثابت ہوئے ان کے خطوط صرف خطوط نہیں تھے کہانی اور ڈرامے کے اجزائے بھی مالا مال تھے۔ ان کے ذریعے لکھنے والوں نے اسلوب اور طرز اظہار کی ایک نئی تازہ اور زندہ جہت دریافت کی تھی مراسلہ نگاری کو ادبی صنف کا مرتبہ ان ہی خطوط کے ذریعے ملا۔ اردو نشر کی ادبی اہمیت میں یہ خطوط ایک نئی دریافت اور تسخیر ہیں ان کے ساتھ زبان کی سادگی اور خمویت کا وہ رجحان پایا تشکیل تک پہنچا جس کی دلغ بیل میرامن نے ڈالی تھی زبان کو سماجی عمل کی حیثیت برتنے میں غالب کا نام سرفہرست ہے گویا انہوں نے اردو زبان کو جسے وہ ہندی کہتے تھے صدیوں کی قید سے رہائی دلا دی اور ان لوگوں میں واپس لائے جن کی گود میں پل بڑھ کر وہ بلوخت کی منزل تک آئی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لفظوں اور محاوروں کے معاملے میں غلط العوام کو معیار بنایا۔ ناسخ اور سودا جیسے اساتذہ کی اصلاح زبان سے ان کو کوٹنے دلچسپی نہ تھی اور وہ علم بولے جانے والے الفاظ کو اسی صورت میں استعمال کرتے تھے چنانچہ نمبر کے بجائے ان کی عبارتوں میں لفظ نمبر ملتا ہے دور جدید کے ایک ذہن اور صاحب فکر نقاد انیس ناگی کو صورت یہ حقیقت بہت بڑی لگی کہ آج تک کسی نقاد نے ان کی بڑائی نہیں لکھی چنانچہ ضروری ہے کہ ان کے

برائیوں کو لکھا جائے انہوں نے اپنی کتاب، غالب ایک اداکار لے میں ان کے کردار اور امیج کو مسخ کر کے اس آفاقی شاعر کی نہایت بڑھاپہ کی پیش کی ہے ان کی مجموعی ذاتی کمزوریوں اور معاملات و واقعات کے حوالوں سے ان کے ادبی و شعری اور علمی ادبی شخصیت کا دسرفہ جائزہ لیا ہے آزاد جنس (Free Sex) کے باب سے میں ان کے نقطہ نظر کو دو اجہی اخلاقیات کے آئینے میں بیان کرنے کی کوشش بیسویں صدی کے بین الاقوامی اور جمہوری دور میں کوئی اچھی بات نہیں ہے ان کے خطوط پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب نے اپنی نجی زندگی اپنے معاشرے اور اپنے اندواجی حالات کو پرکھنا نہیں رکھا۔ علمی و ادبی مشاغل سماجی عمل کا درجہ رکھتے ہیں۔ غالب اپنے عہد کے تہا تخلیقی روٹ تھے جنہیں زبان اور شعر و ادب کی سماجی وابستگی کا اچھی طرح احساس تھا نجی زندگی

لے ایس ناگی کی یہ کتاب عشرہ زمیں لاہور سے شائع ہوئی ہے اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اس میں مصنف نے کسی حد تک فرارڈ کی ٹیکنک تحلیل نفس کو غالب کی شخصیت پر منطبق کرنے کی سعی ناکام کی ہے کیونکہ اگر ہم اس ٹیکنک کے ہتھیار سے خود مصنف کے اندر جھانک کر اصل حقیقت تک رسائی کی کوشش کریں تو بہت سے ذاتی محرکات (Motives) ادا کجاؤ نمایاں طور پر سمجھ میں آتے ہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس رد عمل کے پیچھے کیا محرکات مصوت تماشہ ہیں۔ انیس ناگی غالباً اپنے ہیرو کی ہزری کو.... زندہ دیکھنے کے لئے غالب کی اس حیثیت کو داغدار بنانا چاہتے ہیں جس کے لئے انہوں نے ذاتی واقعات کو حوالہ بنالیا ہے اسباب تک غالب پر لکھی جانے والی تمام تنقید اور تحقیق کو بھی چیلنج کیا ہے گویا یاد کا غالب سے لے کر آج تک غالب پر جتنا کچھ کہا گیا ہے وہ سخنِ فہمی سے زیادہ غالب کی طر اندازی پر مبنی ہے اس قسم کی تصانیف کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر بعض سوالات اٹھائے جائیں اور ان کے جوابات کے لئے مضبوط جواز پیدا کیا جائے ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ سوال منظرِ عام پر آئے کہ غالب ایک دوسرے ملک کا شاعر ہے چنانچہ اس کو یہاں سے دیس نکلا دیا جائے۔

معاشقہ اور ازدواجی حالات ذاتی مدد تک تو ان کے لئے ضرور اہم تھے لیکن دوسروں کے لئے ان کی معنویت نہ ہونے کے برابر تھی فیض نے ان کی شخصیت کے اس رخ کو بڑے سلیقے سے واضح کیا ہے۔

غالب تو اپنے دور کے غم بیان کر رہے تھے جس جہد میں وہ لپکتے تھے جو ان کا معاشرہ تھا ان پر جو گزند ہی تھی وہ سب سائے معاشرے کا دکھ درد اس عہد کا تجربہ اور تجربہ کا درد بیان کر رہے تھے۔ غالب کے یہاں داخلی اور ذاتی طریقہ کار میں سماجی احساس کا عنصر بھی ملتا ہے اس لئے ان کا کلام تنگ نظری اور اپنی فاقہ تک محدود ہونے کے بجائے کل سماج کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہ رائے ان کے خطوط پر بھی منطبق ہوتی ہے مگر ایک ایسے قلم کار کو کیا کہیں جو بہ یک نظر فیض کو پابلو نرودا کے مقابلے میں بلانا قرار دے۔ یہ وہی غالب والی بات ہے کہ دشمنی کے لئے بھی ہم فتنی ضروری ہے خطوط غالب میں بھی زندگی معاشقہ اور ازدواجی حالات نہ ہونے کے باوجود ایک ماہر جاسوس کی طرح انہیں ناگہانی ان معاملات کے بلے میں ساری معلومات جمع کر لیں وہ جبکہ غالب شکن بنا چاہتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ جس جہد میں وہ زندگی کر رہے تھے اس کی ایک جامع سیاسی و سماجی، تہذیبی و علمی، فکری و ادبی اور اقتصادی و سائنسی خاکہ نگاری ان مراسلات میں ملتی ہے اور جمہوری و سائنسی انداز نظر کے حق میں ان کی رائے ان مباحثات میں موجود ہے ممکن ہے کہ انیسویں صدی کے کسی گوٹ یا گروٹر میں اس دور کی اشیائے صرف کی قیمتوں کا ذکر نہ ملے مگر خطوط غالب کے ذریعے یہ فہرست دستیاب ہے حقیقت نگاری اور سماجی مقصدیت کا جو نظریہ بیسویں صدی میں شعروادب کا موضوع بن گیا ہے اس کے بہت سے رخ ان خطوط میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ یہی ان کا مسک بھی تھا علم و ادب تحقیق و جستجو، فلسفہ فکر تمدن و معاشرت اور تاریخ و تنقید کے نہ جانے کتنے پہلو ان کے یہاں موجود ہیں اس طرح اردو کی ادبی نمونہ انہوں نے ایسا انقلابی رخ دیا جو اس سے پہلے

نایاب تھا ان کا طرز بیان قدیم مروجہ انداز سے انحراف پر مبنی ہے۔

غالب کا حمد تنقید بھی بے خبری کا عہد تھا۔ اُنڈو تنقید ایک ادبی صنف کی حیثیت سے اس وقت پیدا ہوئی جب حالی نے مقدمہ شعر و شاعری جیسی کتاب لکھی لیکن غالب کے غلوں ان کے بعض دیباچوں اور اشعار میں سائنس تنقید کی جہتیں نمودار ہو چکی تھیں جس کا اندازہ اس منقرسی عبارت سے ہوتا ہے جو انہوں نے مرید کی خواہش پر تصنیع آئین اکبری کے لئے لکھی تھیں۔ یہ عبارت سائنس تنقید کی اصولیات پر پوری اُترتی ہے اس حوالے سے یہ کہنا بے جا طرفداری نہ ہو گا کہ دواؤد میں سائنسی تنقید کا ابتدائیہ بھی ہیں اور یہ ایک ایسا آفاق اعزاز ہے جو ۱۸۵۵ء کے بعد سب سے پہلے غالب ہی کے حصے میں آیا ہے ان کی ادبی نشر کے اس ذاتیئے کی طرف بھی ہمارے فاضل نقادوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ہے انہوں نے ادبی تاریخ میں پہلی بار پورے اعتماد کے ساتھ برہان قاطع کی لفظی معنوی کمزوریوں کو گرفت میں لیا جو کہ علم زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس کا ثبوت ہے ان کے لئے ایک ایسے کوچے میں قدم رکھنا جہاں تک رسائی اُن کے عہد میں کم و بیش ناممکن تھی کیونکہ اس زمانے کے اساتذہ اور علماء اختلاف نظر اور مروجہ نظریات سے مختلف انداز کو خوش آمدید کہنے کے لئے قطعی راضی نہ تھے۔ بجائے خود غیر معمولی کارنامہ تھا جدید سائنس تنقید جس تہذیب کی گود میں پروان چڑھی ہے وہاں آزادی تحریر و تقریر اور اختلاف ملئے انسانی حقوق کی ہرست میں شامل کی جا چکی ہے۔ غالب نے اپنے عہد میں تہذیب نقد و نظر کی بھی پاسداری کی اور بڑے نقاد کے منصب کو بھی بڑے سلیقے اور حوصلے سے نبھایا۔ معمولی قسم کے اعتراضات کو نظر انداز کرتے رہنا۔ ہر گز وہ بدکلامی سے گریزاور انتہا پسندانہ رد عمل کو درگزر کرتے رہنا ان کا شیوہ تھا۔ قاضی صاحب بڑودہ کے اعتراض پر ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ "قاضی صاحب بڑودہ کو صاف دکھو۔ میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا ہے اگر میں اچھا ہوں تو اس نے برا کہا ہے تو

اس کو خدا کے حوالے کر دو۔

انہیں ناگی نے جو غالب کی زندگی کے ہر واقعہ سے ان کے کردار کو سمجھ کر دینے کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ قسطل سے ہونے والی معرکہ آرائیوں میں بھی ان کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ قاتل شعری حیثیت اور رشتہ دشمنی معیار کے اعتبار سے بہت چھوٹے طبقے کا شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان فارسی داں ہرات کے سفیر نے ان معرکوں میں غالب کی فادس شائستگی کے حق میں یائے دی تھی۔

احترافات کے معاملے میں غالب کا رویہ بہت ہندوب اور محتاط تھا۔ مولوی امین الدین کی گالیوں کا ذکر آیا تو ہرجستہ ایک خط میں لکھا، اگر گدھا کسی کو لات ملے تو کیا تم بھی اس کو لات مارو گے؟

البتہ جہاں دلائل سے گفتگو کا موقع آیا انہوں نے کسی تکلف نہیں کیا۔ ان کی وسعت فکر و علم کا یہ معیار تھا کہ جہاں کوئی اعتراض انہیں بھیجے محسوس ہوا اس کو تسلیم کر لینے میں غر۔ تجربے یا اتنا کو کبھی آڑے نہیں آنے دیا۔ ناظر مکرانی نے ایک فارسی شعرو پر اعتراض لکھو بھیجا اور انہوں نے نہ صرف اس کو تسلیم کیا بلکہ شعری تقبیح بھی کر لی۔ اس حوالے سے بھی غالب کے خطوط کی افادیت مسلم ہے کیونکہ ان کی عبارت میں جدید سائنسی تنقید کا تسلسل نمایاں دکھائی دیتا ہے انہوں نے اپنے جسد کے ثقافتی میاں تاریخی ادبی اور علمی مظاہر کا جائزہ تنقیدی تناظر میں لیا ہے اور اس اعتبار سے کوئی بڑے سے بڑا معاصر ان کے قدم قامت کو چھو کر نہیں گزرا ہے۔

اردو کی ادبی فشرج پہلو سے غالب کے ہاتھوں ایک ایسی کلیت (Totality) اور بلندی تک آگئی جو تاریخ کے ایک مرحلے کو مکمل کرتی ہے اور دوسرے مرحلے کے لئے زرخیز زمین تیار کرتی ہے جس کی سطح سے سرسبز اردو ادب کے عناصر جنم لیا۔ اردو ادب کے ان عناصر خمسہ کے یہاں

غالب کے شعور کی روشنی کا منظر بہت واضح ہے اردو کی ادبی نشر کے حوالے سے غالب کا ازمیر نو مطالعہ امرکائیت کی ایک نئی قلمرو تک رسائی کا سفر ثابت ہو سکتا ہے۔

غالب کے طرفدار

مغربی ادب اور تصور پسند فلسفہ کے زہراثر اردو شعر و ادب کا جائزہ قلمبند کرنے والوں میں ایک اہم لیکن گمنام ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا بھی ہے۔ انہوں نے محاسن کلام غالب پر کبھی جو عالمانہ تاثراتی مقالہ لکھا تھا وہ حوالہ جاتی اور تاریخی اعتبار سے اہمیت و افادیت رکھتا ہے۔ ان کو مغربی ادب اور تصور فلسفہ پر عبور تھا جس کے لئے یہ مقالہ بھائے خود دلیل ہے لیکن ان کی مجموعی تحریروں میں انگریزی زبان و ادب اور علوم و فنون سے مرعوبیت کی وہ بدتمنائی نہیں نظر آتی ہے جو ہمیں کلیم الدین احمد ڈاکٹر احسن فاروقی اور محمد حسن عسکری کے یہاں ملتی ہے۔ بجنوری اور فراقی مغربی زبان اور شعر و ادب پر قدرت رکھنے والے ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے مشرقی تہذیب و شریعت اور ادبیات کی بھالیاتی و ثقافتی اور تاریخی و معنوی بلند یوں کے نامعلوم گوشوں کو مغربی شعر و ادب کے حوالوں سے بے نقاب کیا ہے۔ کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی جیسی سطحیت ان دونوں کے یہاں ہی ہے۔

تعارف و بقایا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا مواد نہ مغربی اقوال و آراء سے کرنے لگے ہیں یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زملے

میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شکریہ

(Shakespeare) ورڈس ورثہ (Words)

(worth) اور ٹینیسن (Tennyson) سے مقابلہ

کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ انوس یہ کوتاہ نظریہ نہیں
جاننے کے شاعری اور تنقید پر کیا دانشہ ظلم ہوتا ہے۔

• محاسن کلام غالب • جیسا اہم مقالہ اپنی کلاسیک اور تاریخت کی وجہ

ہے اب محض ایک تبرک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اس کی مرث اتنی ہی
اہمیت باقی رہ گئی ہے کہ وہ پوری سٹیوں کے نصیبات میں موجود ہے تاہم اس
مقالے میں ایسی تخلیقی قوت اور معنوی جہتیں موجود ہیں جن پر دور حاضر
کے علمی حوالوں سے مزید بحث کی جاسکتی ہے خصوصاً نام ہذا جدیدیت کے رجحان
سے تعلق رکھنے والے حلقوں کے لئے تو یہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ معلوم نہیں کہ

ہمارے فاضل نقادوں اور ادبی نظریہ سازوں نے ایسی اہم دستاویز کو کیوں
نظر انداز کر دیا ہے اس مقالے کے مندرجات سے اختلاف کی یقیناً بہت گہرائش
ہے لیکن مصنف کی تخلیقی قوت اس کے انداز بیان اور تائثراتی جہت سے انکار
نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جدید تنقید میں تاریخی، سائنسی، نفسیاتی اور تائثراتی اور
دیومالائی مکاتب کی ترتیب و تنظیم مدی حاضرہ کی دین ہے ان میں دیومالائی
مکتب ۱۹۵۰ء کے بعد زیادہ نمایاں ہوا خصوصاً برصغیر ہندوستان میں اس
کے اثرات زیادہ محسوس کئے گئے کیونکہ مغرب میں یونان اور مغربی وسطی میں مصر و
شام کے بعد یہی وہ خطر زمین ہے جو دیومالا کا سرچشمہ رہا تھا اور جس کے
تہذیبی سرشت میں اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں برصغیر پر اسکا
اثرات بھی اکی تہذیبی و تاریخی سرشت میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکے بلکہ خود سلاطین
افکار و نظریات نے دیومالائی اثرات سے استفادہ کیا۔

عبدالرحمن بجنوری نے تنقید کا صرف ایک ہی شاہکار چھوڑا تھا جو محاسن

کلام غالب کے عنوان سے کہیں نسخہ حمید کے صفحات پر شائع ہوا تھا۔
 انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا تھا اس کے بعد
 "محاسن کلام غالب" دوبارہ شائع نہیں ہوا البتہ ۱۹۶۹ء غالب صدی کے
 موقع پر رسالہ افکار کراچی نے اس کا متن شائع کیا اور اسی سال فخری پرنٹنگ
 پریس کراچی نے اس کو ٹائپ برکتابی صورت میں شائع کیا۔

ڈاکٹر جنوری نے اپنے تشریحی بیان میں مائیکل اینجلو اور لیونارڈو کے حوالوں
 سے استفادہ کیا ہے جن کے اغاث ان کی تحریر میں ظاہر ہوئے ہیں اور اس
 حوالے سے وہ تاترائی فلسفہ تنقید کے بانی کرچے سے قریب آجاتے ہیں۔ محاسن
 کلام غالب کا اسلوب اور معنوی جہات کی تلاش میں کرچے کی اصولیات کا
 پس منظر موجود ہے جو کہ انیسویں صدی کے اس ماحول میں پایا جڑھا تھا جب
 جرمن فلسفہ تصورات اور ہیگل کو روح عصر کا مقام حاصل تھا کرچے ۱۸۶۶ء
 میں پیدا ہوا تھا اور جب وہ سن شعور کی منزل پر پہنچ کر افکار کی دنیا میں آیا
 اس وقت جرمن تصورات اور ہیگل کے مالگیری اثرات کارل مارکس اور اینجلو کے
 افکار و نظریات کی زد میں آگئے تھے۔ مارکس تاریخ و جدلیاتی مادیت نے ہیگل
 کے نظام افکار کو پیروں کے بل پر کھڑا کر دیا تھا شعر و ادب فلسفہ و فنون اور
 تاریخ کی قلمرو میں مارکس نظریات نے بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ کرچے کی کتاب
 "ایسٹھٹکس" (Esthetic) مطبوعہ ۱۹۰۲ء اس رد عمل ہی کی تخلیق
 تھی اس نے لکھا کہ آرٹ مابعد الطبیعیات اور سائنس پر فوقیت رکھتا ہے
 سائنس آگہی فراہم کرتی ہے جب کہ آرٹ جن کی تخلیق کرتا ہے علم اس کے نزدیک
 دو جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: وجدانی اور منطقی، علم جو تعمیل سے آگہی حاصل
 کرتا ہے آرٹ ہے اور جو عقل کو آگہی کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے سائنس ہے۔ آرٹ
 کی دنیا ایہیج سازی کی دنیہ ہے اور اس پر تعمیل کی حکمرانی ہوتی ہے۔ آرٹ کا
 منصب معروضات کی جماعت بندی اور تعریفات پیش کرنا نہیں ہے بلکہ محسوسات

کا اظہار ہے۔ حسن ایک ایسا ایسی ہے جو تخیل بناتلا ہے اور یہی ایسی صفاک میں آنے والے معروض کی ماہیت سے آگاہ کرتا ہے۔ حسن کا شعور ہی داخل کے اظہار کا محرک ہوتا ہے اور ہم اشیاء کو براہ راست و عبادی تجربے سے محسوس کر لیتے ہیں جب ہم آئٹ کے کسی شاہکار سے لگتے اندوز ہوتے ہیں تو دراصل ہم اپنے ہی وجدان کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ عبدالرحمن بجنوری جب کہتے ہیں کہ "کوئی انسان غریب ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے تو ہمیں یہی صورت محسوس ہوتی ہے۔ کرچے کی طرح وہ بھی تقسیم کے قائل نہیں ہیں اور لکھتے ہیں کہ شاعری کو اکثر شعر نے اپنی اپنی مدد گاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز جذبہ اور وجدان۔ ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ حقیقت خود ان کی نارسائی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی خود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لائق ہے۔" انیسویں صدی میں تاثیریت نے فرانس کو ضرور متاثر کیا لیکن اس کی مرکزیت کا شرف جرمنی ہی کو حاصل رہا۔ بجنوری کے یہاں بھی جرمن تاثیریت کا شعور عادی ہے جہاں میکس لبرمین (Max Liebermann) اور لوس کو رنتو (Luis Corinth) اس کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے اور گستاؤ کلیمٹ (GUSTAN KLIMT) اس کی سرپرستی کر رہے تھے فرانس میں یہ اسلوبی تحریک مقصودی اور مجسم سازی پر زیادہ اثر انداز ہوئی ٹکونیت (Cubism) اس اثر کا نتیجہ تھی۔ جرمن تاثیریت نے اظہاریت کے مقابلے میں ہیئت کو کوئی باہمیت نہیں دی جبکہ فرانسیسی اہل قلم نے ہیئت کے تجربوں کو اولیت دی۔ عبدالرحمن بجنوری نے بھی "محاسن کلام غالب" میں ہیئت سے بحث نہیں کی ہے اس مقالے کے ابتدائے (Prologues) ہی سے تاثیریت کا وہ بہاؤ شروع ہو جاتا ہے جو آخری حد تک بذریعہ کسی لوشک جاری رہتا ہے۔ یہ عبارتیں وحدت تاخرو عمل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

بحال الہی ہر تھے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو ممتا
باری میں سے ہے شاعر کو بھی اِزانی کی گئی ہے جہاں ملکہ کا رنما
ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینش میں مصروف ہیں شاعر یہ کام
علی الامکان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آئے ہے
غالب نے ہزم ہستی میں جو فالوئس خیال روشن کیا ہے
کون سا پیکر تصویر ہے جو اس کے کاغذی پیراہن پر
منازل زلیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

محاسن کلام غالب کا تاثراتی اسلوب فلسفہ و فکر اور معنی و مباحث کی
جزئیات سے اتنا ماری نہیں ہے جتنی کہ مغرب کی تاثراتی تنقید نظر آتی ہے
اس طرح دیکھیے تو موازنہ تشریح اور فکریات کی مباحث بھی مقلدے میں
سمٹ آئے ہیں لیکن یہ کسی بھی طرح تاثراتی اسلوب کی یکسانیت کو مجبور
نہیں کرتے ہیں اور یہی مقلدے کی جامعیت اور خوبصورتی میں اضافہ بھی
کرتا ہے۔ عبدالرحمن بجنوری بلاشبہ غالب کے مداح ہیں لیکن یہ مداحی
بے دلیل نہیں ہے گو کہ دلائل کا تعلق ان کے اپنے نظریہ حیات سے ہے
جو جرمن و فرانسیسی تصور پرستی پر مبنی ہے۔ انہوں نے جدید سائنسی نظریات
سے بھی استفادے کی کوشش کی ہے یعنی وہ نظریات جو ان دنوں زیادہ مقبول
تھے تاہم ان نظریات پر بھی انہوں نے مابعد الطبیعیاتی فضا کی چادر ڈھانپ
دی ہے اور ان میں سے کچھ اکثر نظریات بڑی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔
بجنوری کی مغربی شاعروں اور فلسفیوں کے اتنے زیادہ ناموں کو موضوع بنایا
ہے جو بحث کے توازن میں معنویت پیدا کرنے کے بھلے بے ربطی اور عشیر
ضروری خیال آرائی کے دامن کو وسیع کر دیتے ہیں غالب کے تخلیقی آرٹ
اصداکار و نظریات کی ان مغربی فلسفیوں اور شاعروں سے مطابقت کوئی

مزدی موضوع ہنبر، ان سکتا ہے یہ مطابقت ممکن ہے کہ بعض اتفاقی ہو
ورنہ غالب اور مغرب کے نمایاں فن نگار بعد ہی کے امکانات زیادہ ہیں اور یہ بعد
ہونا ہی ان کی عظمت کی ضمانت ہے کیونکہ مشرق و مغرب کی تاریخی لسانی
تفاقی اور مذہبی و مابعد الطبیعیاتی دنیا میں نہ صرف مختلف بلکہ یکسر متضاد
ہیں ایسی صورت حال میں شاعر کا مقابلہ شکست پر، یعنی سن، ورڈس ورثہ،
ہائی ریش ہلینے، گوئٹے، پال ورلین، رمباؤ، ملائ، بادلیہ، مام برٹ
اسپنوزا، ہیگل، برگسٹن ڈارون برکلی، فیسے وغیرہ سے کرنا بے معنی ہے مرزا
غالب کے شعر سے

گزرے اعدہ شبِ فرقت بیان ہو جائیگا ہے تکلف، داغ بہ بہرِ دھماں ہو جائیگا
کا مقابلہ ورڈس ورثہ کے ان شعروں سے۔

O mercy to myself I cried
if Lucy should be dead.

نہیں کیا جاسکتا، ان میں نہ کو کوئی لفظی مناسبت ہے نہ موضوع کی اور نہ
اسلوب اور تنصاعی۔ اسی طرح ان کے چند شعراء کا پال ورلین کی نظم سے مقابلہ
بھی محض مبالغہ ہے۔

پال ورلین (Paul Verlaine) کی مشہور نظم میرا
خواب (Mon Reve Familien) مرزا کے مفصلہ ذیل قطعہ
سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشر ہا شاو اب رنگ و ساد ہا مست طرب
خیشہ سے سرو سبز جو تبارِ فقر ہے

ایسی کئی مثالیں اس مقالے میں موجود ہیں جن کی معنویت وجہ نزاع
ہی سکتی ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی نصف دہائی کے بعد مغربی شعراء ادب
اور فلسفہ و افکار کے حوالوں سے استفادہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں سمجھی

ہاں سکتی ہے کیونکہ دنیا کے مختلف خطے اس دور میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب آ گئے ہیں ذرائع اہلارض نے ان کے درمیان روابط کے مسئلے کو آسان بنا دیا ہے اور مختلف زبانوں میں تراجم کے ذریعے افکار کی تربیل بہت تیز ہو چکی ہے چنانچہ اہل مغرب اور اہل مشرق دونوں ہی ایک دوسرے کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔

۱۰۔ ماسن کلام غالب کا منظر فصاحت و بلاغت اور عروض سے شروع ہوتا ہے مصنف نے ان تینوں حوالوں سے غالب کی یکتائی کے لئے جو ادلائش کیلئے ہے تاہم لسانیات کی سائنس کے اعتبار سے یہ مطالعہ نا کافی اور تشنہ ہے بحور و اوزان کی اہمیت اپنی جگہ صحیح ہے لیکن غالب نے شعری زبان کو وجدانی ٹیکنک سے ہٹ کر سماجی عمل کی حیثیت سے استعمال کیا ہے اور بعض شعروں میں ایسے الفاظ دیدہ و دانستہ استعمال کئے ہیں جن کو ان کے عہد کا شعری مزاج مبتذل اور غریب تصور کرتا تھا البتہ اردو شاعری کی تنقید نے اس حقیقت کی طرف یقیناً کبھی نظر نہیں ڈالی کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف صلیح کا اہم ہنر تھا کہ غالب جو قالب شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔ اردو شاعری نے فن موسیقی کو کبھی اپنا رہنما نہیں بنایا جبکہ ہندی شاعری کی اساس کلاسیکی سُرور پر تھی جیسا کہ خسرو کے یہاں ہے برصغیر کے شمال مغرب میں سندھ اور پنجاب کے بعض صوفی شاعروں نے بھی شاعری کی تنظیم میں موسیقی کے سُرور کا خیال رکھا ہے خصوصاً شاہ عبداللطیف جٹائیؒ نے تو کئی ہندی کلاسیکی سُرور میں شعر کہے ہیں۔ ان معنوں میں مرزا غالب کی شاعری کا بھی فن موسیقی سے کوئی براہ راست رابطہ نہیں بنتا ہے۔

اگر اپنی حیثیت سے غور کیا جائے تو دیوان غالب کیسا ہے۔

بلاغت یعنی تخیل الفاظ بلا اختلاف معنی اس سے زیادہ ممال کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کو پرکن کہا جا سکے خصوصاً

کی یہ کیفیت ہے گویا دریائے لطافت رواں ہے۔

اگر ہر ہفتا کی رو سے لیا گیا جائے تو یہ کتاب اپنا جواب آپ
ہے شعر کی بنیاد عروض پر قائم ہے عروضی موزونیت کی سیستان
ہیں الفاظ کے تولنے کا نام ہے نقطہ تعدیل کو پانے کے لئے صدا
ناک سے نازک اور گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہے
اور یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لئے ہیں کوئی آسان
سے آسان اور مشکل سے مشکل بھرا ایسی نہیں جس میں مرزا نے
کلام موزوں نہ کیا ہو۔ جہاں ان کے یہاں وہ بھری ہیں جو خط
مستقیم سے مماثل ہیں وہیں وہ بھری بھی موجود ہیں جن کے
صورت اندازے اقلیدس خطوط منحنی اور دائرے سے مشابہ ہے
جہاں رواں بھری موجود ہیں وہیں افتاں و خیزاں بھری بھی
ہیں مثلاً ۔

کہتے ہیں ہم نہ دیں گے دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

گارا گاہ ہستی میں لالہ دارِ سلاں ہے
برقِ خرمین راحتِ خونِ گرم دہتاں ہے

اگر میری جہان کو ستار نہیں ہے
طاقتِ بیداد انتہا نہیں ہے

عجب نشاط سے جلا کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سرخسوں سے بچے قدم آگے
بہت سے شعراء جن میں استاد شامل ہیں عروض کو شعر کے
تکبیل کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا
مدعا اس موسیقی کی طرٹ سامد کو رہنما کرتا ہے جو قالب شعر کو

کہتے ہیں ہم نہ دیں گے ہم۔

اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔ اگر شعرا زروئے ملامیلین مفاعیلین
مفاعیلین درست ہو لیکن آہنگ تشہ رہ جائے تو غام ہے۔ ایسا
شعر مثل ایک آئینہ کے ہے جو گلشن سے سالم اور درست باہر
آئے لیکن حیتل سے محروم ہے۔

مرزا غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے
یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرع تار و باب نظر آتا ہے اور ان
رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ایک ہنایت متعل
بمحر ہے الفاظ ہنایت آسانی سے اس کا جامہ قبول کر لیتے ہیں۔
شعرا نے اردو اکثر اس کو کام میں لیتے ہیں لیکن عیب اس
میں یہ ہے کہ مصرعوں میں رقص صوتی کم پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ
فارسی کا شعر :-

ہر کہ خواہد گو بیاد ہر کہ خواہد گو ہر د ! !

گیر و دار حاجب و دربان ہیں در گاہ نیست

جو وصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہے۔ باوجود استاد کی کاوش

و کاوش کے معیار رسانہیں ہوا اس کے مقابلے میں یہ ترانہ
ویز شعر ملاحظہ ہو۔

ہم نشیں مت کہہ کہ ہر ہم کر نہ بزم عیش و دوست

داں تو میرے نال کو بھی اعتبار لغت ہے

غالب کے شعر کی موسیقی کی خوبی بلا امداد ساز و ترنم کے تریل

سے دریافت ہو سکتی ہے۔

عبدالرحمن بجنوری کا دھوی کر گوٹھے اور غالب پر شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔

ہے ہر پہلو سے ہنایت جبر علی خیال ہے یہ خیال بجائے خود اس اصول ارتقا
کے خلاف ہے جس کی کالت مصنف نے بڑی شد و مد کے ساتھ کی ہے اور

یوں ان کے اپنے فکر میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ اگر مذاہب متعبدت سیاسی مفادات اور علاقائی تناظر سے ہٹ کر غور کیا جائے تو غالب و فیض کے مقابلے میں اقبال کی حیثیت ذرا کم ہی محسوس ہوتی ہے غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدے سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہے، بہت کمزور تجربہ ہے۔ ان کے اکثر اشعار اس کے برعکس ہیں۔ انہوں نے تو اشیائے خارج کو بطور معروضہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے اشیاء و معروضات کی ماہیت کا سراغ لگا یا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سائنسی نتائج سے زیادہ قریب تر نظر آتے ہیں۔

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی مگر کھلا
ہر چند ہر مشاہدہ حق کی گفتگو جنتی نہیں ہے باد و سار کچھ بخر
کانے کا دے منت کھائی تھائی زچہ صبح کو ناشام کا لانا ہے جوئے شیر کا
ان کے علاوہ کہتے ہی اشعار اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ غارِ کج کا مشاہداتی عمل ہی ان کی فکر کا پہلا حوالہ ہے۔ زبان یقیناً ارغوی ہے لیکن شاعرانہ خیالات سماوی نہیں ہیں۔ اس منزل پر مصنف نے بڑی شوگر کھائی ہے۔ اقبال راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود وجدان کو الہامی رابطہ تسلیم نہیں کر سکے اور اس کو ذہن کی ایک مخصوص اعلیٰ تر صلاحیت ہی سے تعبیر کرتے تھے۔ اردو شعروادب کی تاریخ میں مالی پہلے نقاد تھے جنہوں نے پہلی بار خیال کو مانے کی پیداوار لکھا تھا۔ غالب نے تنگنائے غزل کے بات جس حوالے سے کی تھی وہ عبدالرحمن بجنوری کے خیال سے مختلف ہے وہ جو کچھ لوگوں سے کہنا چاہتے تھے ان کے عہد کی شعری لغت اور کلاسیکی مدد بنی اس میں رکاوٹ پیدا کرتی تھیں اور اس سے جو آئین جنم لیتی تھی تنگنائے غزل کے شکوے کا سبب بنی حالی ہی کو کسی بھی شکل و ریش تھی۔

کوئی عزم نہیں ملتا یہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

غالب کی شکل پسندی کا دفاع بھی انہوں نے ذرا مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔
 دیوان غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پلنے سے
 ذہن مطلقاً قاصر ہے تخیل عرصہ امکان میں ہر جانب پرواز کے
 بعد مجبور واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن
 ہے بہت سے نقاد اس کو "کیٹ خراب" پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا
 نہیں ہے۔ گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاوسٹ (عقہ دم)
 میں ہے یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا ایک دن
 ایکرمان (Eckermann) نے گوئٹے (Goethe)

سے دریافت کیا کہ اس اشکال کا کیا باعث ہے ؟

مابعد الطبیعیاتی اور تصوراتی فلسفے نے حیرت و ہراس راریٹ کے مسئلے کو
 انکشاف حقیقت کے خلاف موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے چنانچہ انیسویں
 صدی کے انگریزی و فرانسیسی شعراء وادب نے فطرت پرستی، رومانیت اور پراسرار
 کوجالیات کے تلمے بانے میں پیش کر کے سائنسی حقیقت پسندی کے خلاف ایک
 مبہم مشروع کی جو مکمل ناکامی پر منتج ہوئی۔ محاسن کلام غالب کے فاضل مصنف
 نے گوئٹے کے حوالے سے اس مبہم سائنسی تصور کو حقیقت کے معنوں میں پیش کرتے
 ہوئے غالب کے مبہم اشعار کو کمالِ فن کے مترادف قرار دیا ہے۔ بیسویں صدی
 میں نام نہاد حلقہ جدیدیت نے بھی اہم اور تجربہ ریت کے دفاع میں اسی قسم
 کے دلائل سے کام لیا ہے اور اس معیار کی پذیرائی کی ہے کہ خیال کا جنم سے
 بالا تر ہونا ہی کمالِ فن ہے۔ سمجھو رہی لکھتے ہیں۔

گوئٹے نے جواب دیا یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ خیریت ہیں
 لوگ ان مقامات پر لایٹل مسائل کی مثال ضرور کرتے ہیں اور اپنی
 ناکامیابی سے نہیں اکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تخیل ہے اگر کسی
 فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمالِ فن ہے اور اس بات پر اصرار نہ

کرنا چاہیے کہ اس کے پس پشت کیا ہے لیکن بچے جب آئینہ میں
اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشت آئینہ کو بھی
دیکھنے لگتے ہیں۔

غالب کی شعر گوئی میں لفظوں کے استعمال جیسے موضوع پر بحث البتہ
مفید اور مثبت ہے۔ اس مرحلے میں انہوں نے زبان کے ارتقاء کی اس حقیقت
کا اعادہ کیا ہے جس کو کتب، سائنس پر استواء ہے یہ بات یقیناً صحیح ہے کہ اگر
یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی ہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے گی۔

دبان ارتقاء کی پابند ہے۔ الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں
گو منطق کے قواعد لا تبدیل ہیں۔ تصورات بہرہ و وقت تبدیل
ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ
ہے۔ الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ
ہوتی ہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے زبان کی تجدید مذہبی یا
تمدنی اصلاح سے آسان نہیں جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل
ہے محاورے کا مٹانا بھی مشکل ہے بہت سے ادیب اس نکتے سے
خافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بلحاظ عمر آخر ضعیف ہو کر بے
جان ہو جاتا ہے چنانچہ اردو میں اس وقت بہت سے محاورے
ہیں جو حقیقت میں الفاظ اور فقرات کی ”میاں“ ہیں۔ مرزا
نے اپنے دیوان میں محاورے کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے تمام
دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی محاورہ
باندھا ہے۔ مرزا کی شاعری دلی کی گلیوں یا مکشوں کے کوچوں کی
پابند نہیں بلکہ آزاد اردو زبان ہے، جب مرزا نے اپنے فلسفیانہ
خیالات کے لئے سوزوں الفاظ کی تلاش کی تو اردو کے ذخیرہ الفاظ
کو بہت محدود پایا۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا

• ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔

• نئی لسانی تشکیلات کے ہمنوا مانع زبان سے مطبق نہیں ہیں ان کا وہم ہے کہ مانع زبان عصر حاضر کی فکری پیچیدگیوں کا اظہار میں مانع ہے کیونکہ اس کی لغت میں وہ الفاظ نہیں ہیں جن کی مدد سے ان پیچیدگیوں کو اسی صورت و معنی کے ساتھ پیش کیا جاسکے جو واقعی ہیں اس مقصد کے لئے اضافہ ہونا اوس نے زبان کو توڑ پھوڑ کر ایک نئی لغت بنانے کی کوشش کی۔ اس قسم کی مہم جوئی ظاہر ہے کہ بے معنی سی چیز ہے زبان کا براہ راست تعلق حوام سے ہوتا ہے اسکی تشکیل و تخریب حوام ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہ فطری عمل بہت آہستہ اور غیر شعوری ہوتا ہے۔ حالات کے تقاضے نئے الفاظ کو خود جنم دیتے ہیں اور اس اصول کو سند فراہم کرتے ہیں کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔ مقالہ نویس نے قواعد جیسے اہم موضوع کو بھی چھیڑا ہے مشرق کی کلاسیکی زبانوں نے ہمیشہ نہ صرف قواعد کی پابندی کی بلکہ اس کو لازمی تصور کیا اور کہیں اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ جس طرح وقت کے ساتھ تمام سماجی اور تہذیبی قدیں تبدیل سے چمکنار ہوتی ہیں اسی طرح قواعد کے اصولوں میں بھی تو وسیع اور ترمیم ہوتی رہتی ہیں اور چوکھتی ہیں۔ دور جدید میں لسانی کے بعض ماہروں نے بھی اگر کو اسی پس منظر میں موضوع بنایا ہے بہنوری نے اس سلسلے میں بہت صحیح نتائج اخذ کئے ہیں تاہم اس میں وہ صرف شاعری کو شامل کرتے ہیں جبکہ اس کا اخلاق ہر ادبی صنف پر ہوتا ہے۔ قواعد کی بہت زیادہ سخت گیری اظہار کے عمل میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے صنائع و بدائع کے بارے میں بھی ان کے خیالات لائق توجہ ہیں۔

صنائع اور بدائع سے خوب کلام ترتیب نہیں پایا سکتا قابل عزت

ہیں وہ تمام فضائل جنہوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں تو شعراء کا ذرا سا بھروسہ نقصان نہیں۔ صنائع اور بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام اور بی زندگی سے جدا کر دیتا ہے اور جس زمانے میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ انعام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے غالب بہت کم صنائع و بدائع کا استعمال کرتے ہیں ان کے کلام کے اشکال کا باعث فارسیت کا قلب الغاظ کا ادق ہونا اور تریب کا پس و پیش ہونا ہے اس میں صنائع اور بدائع کے مشکلات کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

حسن تو ان کا پایہ بند نہیں ہے بلکہ ہمہ قیود سے آزاد ہے اپنی جگہ دست ہے لیکن اس اہم فلسفیانہ نکتے کو انہوں نے تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ حسن دراصل ایک مادی و افادہ قند ہے نہ کہ مادی یا مابعد الطبیعی اور جہاں تک مقالہ نوائس کا تعلق ہے حسن کے بارے میں ان کا تصور مابعد الطبیعی اور مادی ہے ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ حسن کی آفرینش محض مشاعروں کا کام ہے۔ مقصوری (imagery) کے حوالے سے غالب کا مطالعہ نہایت اہم چیز ہے اور بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ کچھ ہے اپنی جگہ درست کہہ سکتے ہیں لیکن کئی ایسے شعرا ان کے حوالے میں آئے ہیں جن کا مقصوری سے تعلق نہیں ہے اس کی وجہ "مقصوری کے حقیقی مفہوم سے مصنف کی نا آشنائی ہو سکتی ہے شاید وہ کسی خیال یا منظر کی وضاحت کو بھی مقصوری سمجھتے ہیں مقصوری مفہیم یا منظر کی وضاحت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی تصویر کا ذہن کے سامنے آنا ہے جو اشعار و خطوط کے واضح احساس کو ابھارے۔

لے تولوں سوتے میں اچھے پاؤں کا لہرنگ ایسی باتوں سے وہ کامریدگماں ہو جائیگا

اس شعر میں مصوری نہیں ہے بلکہ ایک کردار اور اس کے عمل کا واضح بیان ہے البتہ یہ شعر ہے

سیاہی جیسے گر جانے دم نقویر کا نذر
مصوری کا نمونہ پیش کرتا ہے کیونکہ کاغذ پر سیاہی گر جانے سے ذہن ایک
نقویر کا ادراک کرتا ہے۔ اور یہ نقویر شاعر کے باطنی احساس کو ہو بہو
دوسروں تک پہنچاتی ہے۔

غالب کے بارے میں اقبال کہ نقطہ نظر کا ذکر ایک اہم حوالہ ہے خصوصاً
آج کل اس کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ بعض اہل قلم مضامین سیاسی و علاقائی
تحریر کے مغلوب ہو کر غالب کے غلات مولد آرائی میں منہمک ہیں۔

قدرت مستور حقیقت ہے۔ قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوار
حائل ہے جس میں سے نہ صرف شاعر کی نظروں کی افلاطینی گزر پاتی ہیں اس
نظر کے معنویت و جذبہ نواز ہے۔ قدرت اور عوام میں ممکن ہے کوئی دیوار حائل
ہو کیونکہ عوام کی علمی سطح محدود ہوتی ہے تاہم علماء کے بارے میں اس قسم
کی ضرر اگاتا درست نہیں ہے جہاں تک قدرت کے مستور ہونے کی حقیقت
کا مسئلہ ہے تو دور حاضر کے جدید سائنسی انکشافات اس کے حق میں نہیں ہیں
کیونکہ بیسویں صدی کے پہلی نصف کے بعد انسان نے قدرت کو پوری طرح تسخیر کیا ہے
اور حیات و کائنات کی اصل حقیقت کو پالیا ہے جس کی وجہ سے مابعد الطبیعیاتی
فلسفہ کے نظریہ تخیل و ہراس راہیت کا جامہ و سٹنڈ اپڑ گیا ہے جس میں اس حقیقت
سے اتفاق ہے کہ غالب کے یہاں سادگی و ہوشیاری اور بے خودی و پرکاری
کا انتہائی کمال ہے اور ان جمالیاتی و اسلوبی اجزائیں خارج ہیں و داخلی شعور
و الاشعور کا نہایت موندن استراچ بھی ہے۔ ان کے یہاں شعری تشکیل کا
حرک و جہان تجزیہ و تخیل کی راہ سے گزر کر صورت و معنی تک پہنچتا ہے جس
کو خود انہوں نے قطر سے گہر تک کا سفر قرار دیا ہے لیکن بھنوری صاحب

جو نیکو وجدان کے بائے میں تصوراتی نقطہ نظر کے قائل ہیں اس لئے وہ شعری تشکیل کے اس طریقہ کار کی تحسین نہیں کر سکتے، مجموعی طور پر ان کا مطالعہ مابعد الطبیعیاتی اور تصوری ملکیت خیال ہی کا پابند ہے جس کے سرے فلسفہ تصوف سے جاملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔

مولائے مہر ان فنونِ لطیفہ کے کوئی بھی عالم کے مظاہرات غائب اور باطنی کو نہیں دیکھ سکتا اور اسی وجہ سے ان کا اظہار نہیں کر سکتا۔
 • سہل مستح کے حوالے سے غالب کے بائے میں ان کی روش پر وہ ریش نہیں ہو سکتی ہیں۔ کانٹ کے تصور آزاد حسن اور بادلیہ کے تصور شاعرانہ حسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کانٹ (Kant) نے اپنی کتاب (Kritik der urtheilskraft) میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں - آزاد حسن - جو تاہے وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی بیان کرتے ہیں بلکہ اپنی خوشبو سے مشامِ جاں کو مسرور کرتے ہیں اگر ان کے نشر کرنے اور ان کے مطالب کی دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کی پتیوں کو توڑ کر میسرہ کرے، بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آ جاتی ہے اور عجیب پر لطف پریشان مطلب مظاہر پیش کرتی ہے۔

لودویمیر (Baudelaire) لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب تمام حواس ہنایت درجہ تاثیرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردہ ابد

نیمک دیکھنے لگتی ہیں، پر ضرور مقامات میں خفیف حسن بخینف آواز
 کو کان ٹھننے لگے ہیں اور شور سے بالکل نا آشنا بہتے ہیں اختلاف
 خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے
 بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں اور خیالات
 میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے، آوازیں رنگین معلوم
 ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں فقر پیدا ہو جاتا ہے۔

کانٹ اور بادلیہ کے تقورات کا ماخذ مابعد الطبیات اور فلسفہ تقویٰ
 ہے جبکہ غالب اپنے نظریہ حیات اور عمل کے اعتبار سے مادہ پسند واقع ہوئے
 تھے چنانچہ ان کے اسلوب کی ان خوبیوں کا مطالعہ موجودات کے حوالوں سے
 کرنا زیادہ معنی آفریں ہو گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

مرزا کی دلوانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام برٹ
 (Alfred Hombert) سے کچھ کم نہیں، مام برٹ
 اپنے جنون میں کہتا ہے۔

Da mond und sonne dir ewig kalt ist und
 dir das sternengewöl be ewig alt ist.

Und in der finsternis zer reisst dem
 gang lausche meinem geasang.

مرزا صاحب فرماتے ہیں :-

ہم زوال آمادہ احبزاء آفریش کے تمام

مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیان

دلوانگی کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے اس کی کوئی وضاحت کے بغیر

جرمن زبان میں انہوں نے مام برٹ کے اشعار نقل کر کے ایک حتمی فیصلہ صادر

کر دیا ہے اگر وہ ان اشعار کا اردو ترجمہ بھی لکھ دیتے تو شاید شعر و ادب کے

کے قارئین کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے۔ حسن کا مبدائے عالم ہونا۔ مادہ و حرکت کی توضیحات اور وحدت الوجود کا ذکر معصفت نے فلسفہ تصوف کے حوالوں سے کیا ہے جس کا محرک فلسفہ تصوف کی طرف ان کا اپنا جھکاؤ ہے غالب فلسفہ تصوف کے اخراجات سے مالوم نہیں بلکہ مسک کے اعتبار سے بعض معاملات میں وہ وحدت الوجود اور وحدت کل کے قائل بھی تھے۔ لیکن ان مسائل کو انہوں نے اپنی حقیقت پسندی اور فکری کی سائنسی جہت سے ہم آہنگ کر کے ایک اپنا نظریہ بنالیا۔

محسن کلام غالب کی بنیادی خامی تاثراتی اور مابعد الطبیقاتی اسلوب اظہار ہے۔ تاثراتی اور مابعد الطبیقاتی انداز اس اعتبار سے کمزور ہوتا ہے کہ اظہار رائے کرنے والا اپنے شعور اور لاشعور اور ارادے کو بے سرو سامان سے چھوڑ دیتا ہے اور عقلی قوت سے استفادہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا ہے اس کے لئے تصدیق بے معنی چیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقالات میں با سجا ایسے مقامات آئے ہیں جہاں بے لگام اظہار کا تسلسل دکھائی دیتا ہے اس طرح بعض اشعار کی جو تشریح صاحب مقال نے پیش کی ہے وہ بھی محض قیاس ہی ہو سکتی ہے محسن کلام غالب کے فاضل مصنف نے اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کیا شعر و ادب کی معنوی جہتیں تلاش کرتے ہوئے لکھنے والے کی پوری شخصیت اس کے عملی کردار و معمولات کو بھی مطالعہ کا حصہ بنانا پڑتا ہے۔ غالب کو ان خوب قسمتیوں میں جن جن کے یہاں افکار و معنی اور عملی زندگی کے برتاؤ میں کوئی قدم مطابقت نہیں پاتی باقی ہے۔ اردو شعر و ادب میں شاید ہی کوئی اتنی قدآور شخصیت ہو جس نے اپنے زندگی کے ہر عمل کو اس کی حقیقی صورت میں منکشف کیا ہے اس نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعہ اپنی ہی شخصیت کے تمام منفی و مثبت پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے منکشف کیا ہے اس اعتبار سے وہ حوصلے کی اس منزلی

ہر بے جہاد ایک منزل اور جامع انسان ہی پہنچ سکتا ہے۔ معاصر کلام غالب کا احاطہ کرتے ہوئے چمکے، ساحر نقاد و سحر النساء نے حق نقد ادا کیا ہے۔
حالی کے بعد غالب کے دو سرب اہم نقاد ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ہیں۔

حالی کو جلتے ہوئے ادبی مذاق اور تغیر آمیز شاعری کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا وہ جانتے تھے کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منہمکے کمال تک پہنچ گئی ہے اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرق لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا:

غالب کے ضمن میں مشرق لٹریچر سے سبق لینے اور انگلش لٹریچر سے اخذ و استنباط کی صلاحیت کی شرط سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے پوری کی۔ وہ عربی، فارسی، ترکی کے وسیلے سے مشرقی ادب اور جرمن، فرانسیسی اور انگریزی کے ذریعے مغرب کے ادب اور افکار سے براہ راست واقف تھے اور ان کو اپنی ذات اور اپنے مزاج کا حصہ بنالینے کا اگر انہیں خوب آتا تھا ڈاکٹر بجنوری نے اپنے احساس جمال اور مطالعے کی وسعت کو اپنے تجربے یا نئے شعور اور دلکش اسلوبِ نشر سے ہم آہنگ کر کے غالب کو ایک نئے زائے سے آرا دو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تذکروں کے ذریعہ جو ایک رسم چلی آرہی تھی کہ غالب کو سراہنا ہو تو اسے غزل میں نظیر ہی اور قصائد میں حرفی غافا کے ہم پلہ قرار دے دیے جاتے بجنوری نے ختم کر دیا۔ انہوں نے پہلی بار مغربی شعرا کے ذہنی آفتاب سے غالب کی فکر اور اسلوب کا موازنہ کیا اور اس طرح ایک پختہ پافانہ اور رسمی انداز نگارش سے ہٹ کر تجرباتی عنصر اور جمالیاتی شعور کو تنقید میں شامل کیا۔

مغرب کے بعض اعلیٰ نقادوں اور انشاء پردازوں کی طرح بجنوری نے بھی

”نسخہ حمید بہ“ کے مقدمے کا جو بعد میں ”مماسن کلام غالب“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا پہلے ٹیکے، براہ راست، مختصر اور ڈرامائی آغاز میں آفاذ کیا ہے۔ ان کے بعد آل احمد سرور اور ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بجنوری کے اس انداز کی قابل ذکر پیروی کی ہے۔ عراقی علوم کے بحث میں جس طرح روستو کے ”معاہدہ عراقی“ کی پہلی سطر ”انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جبر و یکسوہ و پاپہ زنجیر ہے“ اپنے ایجاد و اختصار اور جامعیت کے باعث اب تک ان گفت بار دہرایا گیا ہے اسی طرح نقد غالب کے میدان میں بجنوری کے ”مماسن کلام غالب“ کی اس پہلی سطر کو بار بار نقل کیا گیا اور متعدد نقادوں نے موضوع بحث بنایا ہے۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوان غالب۔

ہر چند کہ الہامی کتاب کا تصور خود غالب کی اس رباعی سے پیدا ہوا ہے۔

جس میں غالب نے اپنے دیوان کو دیں سخن کی کتاب ایزدی قرار دیا ہے۔

گر ذوق سخن بہ دہر آئیں بولے

دیوان مرا شہرت پر دیں بولے

غالب اگر این فن سخن دیں بولے

آں دیں را ایزدی کتاب این بولے

جس طرح ان جانی نس (LONGINUS) کے زیر اثر شاہد چوبی

صدی میں ملن کے لئے (SUBLIME) کا لفظ ایک مروجہ اصطلاح بن

گیا تھا اسی طرح غالب کے کلام کے لئے ”الہام“ کی اصطلاح بجنوری کے بعد بہت

عام ہو گئی ہے۔

عبدالحق بجنوری نے ابتداء میں غالب کے کلام سے ہٹ کر خود قواعد

اور معافی و بیان کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہو جاتا

ہے کہ تخلیقی عمل کو میاں کی اصولوں کا پابند نہیں رکھنا چاہیے اور چونکہ خود تخلیقی

نثر لکھتے ہیں اس لئے اصطلاحات اور مروجہ اصولوں کی جانب ان کا وہ قدر سے

آزاد یا "دوماؤی" ہے۔ انہوں نے "محاسن" میں کیا خوب کلمہ ہے "تھیکٹر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد کا کام ہے کہ ان کی پابندی کر ڈاکٹر بھجوری نے غالب کے ذہن کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی فکر اور اس کے الفاظ کے تقاضات کو نئے احساسِ جمال کے ساتھ اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر بھجوری نے مغرب کے قدیم و جدید اکابر شعراء و مفکرین سے غالب کا موازنہ کیا ہے لیکن انہوں نے انگریزی طرزِ تنقید کو جوں کا توں اختیار نہیں کیا بلکہ شروع میں ہی انہوں نے اردو کے خیالات کو مغربی طرز پر جانپننے کی مخالفت کی ہے انہوں نے دراصل اپنے مطالعے اور مغربی ادب سے اپنی آگہی کے سہارے وہی طرز اختیار کیا ہے جو عائی نے "یادگار غالب" کے دوسرے حصے میں اختیار کیا ہے یعنی مختلف اکابر شعراء سے موازنے کے ساتھ ساتھ غالب کے اشعار کی اپنے انداز میں تشریح، البتہ عائی کے اس عمل کو بھجوری نے بہت اگے بڑھا دیا ہے۔ عبدالرحمن بھجوری نے کلام غالب کی تشریح اور توضیح کے دوران فلسفے کے علاوہ علم طبیعیات اور علم مناظر و مریا کے اصولوں سے بھی اپنے موقف کو بڑے دل نشین پس منظر میں ظاہر کیا ہے۔ اور غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سائنسی اصطلاحات اور سائنسی اصولوں کے ذریعے تنقید کو وسیع بنانے اور بعض انسانی تجربات و مشاہدات کی تفہیم کا یہ انداز پہلی بار عبدالرحمن بھجوری نے اردو تنقید میں شامل کیا ہے چنانچہ ڈارون کے نظریے ارتقاء اور ڈالٹن کے نظریے سالٹا سے بھی انہوں نے "محاسن کلام غالب" میں بحث کی ہے۔

بھجوری کے اسلوبِ تحریر کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ فلسفیانہ مباحث کے ابواب کو ایک دو سطروں میں بیان کرتے ہیں اور پھر اس سے اپنا ایک نتیجہ خود اخذ کرتے ہیں اور اس طرح غالب کی فکر اور جذبے کے باہمی رشتوں کے سرسبز رموز بڑے آواز کھے انداز میں افشا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر بھجوری نے بعض نقادوں کی طرح آئین تنقید کا جادو چلانے کے لئے

حالی کی اہمیت کو کم کرنے کی کوششیں نہیں کی ہے۔ اردو شاعری کے شہیاد
 واستعارات کے ضمن میں جب انہوں نے شعراء کے لیکر کے فقرے لکھے ہیں، ان کی روش
 پر اعتبار خیال کیا ہے تو اپنے موقف کی حمایت میں خود حالی کا قول پیش کیا ہے۔
 انہوں نے کمال کر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ حالی نے مرزا غالب کے کلام کی
 نئی دنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے کچھ کم مستحق
 داد نہیں ہیں :

ڈاکٹر بجنوری کی ان تمام تر خوبیوں کے باوجود یہ بات چند سنجیدہ اذہان کو
 اچھی نہیں لگی کہ انہوں نے بعض اوقات اکابر سے غالب کے موازنے کی رو
 میں کسی جگہ صرف نام گنوا دیئے ہیں اور صحیح معنوں میں موازنے کا کوئی
 انداز پیدا نہیں کیا ہے۔ لیسر کہیں کہیں زور بیان اور تخیل کی رو میں اتنے آگے
 نکل جاتے ہیں کہ شعر میں تنقید سے زیادہ افسانے اور داستان کا رنگ پیدا
 ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ توازن برقرار نہیں ہے جو مصنف نے
 اپنے مخصوص منطق انداز کے ذریعے قائم کیا تھا۔ شاید اسی لئے بعض نقادوں کو
 بجنوری کی تنقید کسی حد تک جذباتی معلوم ہوتی ہے۔

اس مجموعی صورت حال کے باوجود، ہم اس کلام غالب کے بارے میں یہ کہنا
 کہ وہ غالب کی طرف ذرا کی گنجائش کا نمونہ ہے صحیح نہ ہوگا۔ البتہ کہا جاسکتا ہے کہ
 اس کے بہت سے نکات، تاثراتی ہونے کے باوجود جدید سائنسی تنقید
 کی کسوٹی پر پڑتے آتے ہیں اس طرح غالب کا یہ دعویٰ کہ وہ
 غالب اگر این سخن دین بود آں دین را ایندی کتاب این بود
 اور بجنوری صاحب کا فقرہ ہے
 ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس دیدار اردو دیوان غالب
 مبالغہ کے باوجود بے معنی نہیں ہیں۔

غالب شکن

اردو کی جدید غزل کا ایک اہم نام مرزا یاس ریگاز چنگیزی ہے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے پہلے دور کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی لہجے اور روایت کے مردہ جسم میں سائنسی فکر کی تازہ روح پھونک کر کلاسیکیت کو سہید حاضر کے رنگ و آہنگ سے سجایا ہے۔

بہار آؤ رٹنے والے زمین سے ہار گئے۔ اسی زمین میں دیا سوائے ہیں کیا کیا اس اقبال سے وہ جدید غزل کا اہم نام ہیں لیکن ہماری شاعری کی تاریخ نے جو ذاتی بغض و عنادیں پسند و ناپسند سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکی ان کو بلا جواز نظر انداز کیا ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد میاں کے نقادوں نے سوائے پروفیسر مجتبیٰ حسین ان کو موضوع نہیں بنایا۔ کچھ اہل نظر ان سے اس لئے ناامنی ہے کہ وہ اقبال کے مخالف تھے۔ ان مجموعی حقائق کے ساتھ جب ہم جدید غزل گوئی کے حوالے سے ان کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو وہ جدید غزل کے بانیان میں اقبال سے زیادہ بلند مقام پر دکھائی دیتے ہیں۔ ریگانہ ایک حوصلہ مند اور مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی خودی بلند تھی اور خود داری آثار پرستی کی انتہائی حد کو چھوٹی تھی بزمِ انداز شخصیت کے اقبال سے وہ غالب ثانی تھے بلکہ شعری اسلوب اور فکر کے کچھ میں بھی ان کا رنگ غالب ہی سے مطابقت رکھتا تھا نظریئے استواری کے معاملے میں بھی وہ بہت کثر تھے ان میں نہ لہک تھی اور نہ رنگوں جو جانے والی کیفیت یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

ہر بات کا مقابلہ کیا اور وہی کچھ کہا جو وہ کہنا چاہتے تھے تحلیل نفسی کی ٹیکہ کو۔ اگر ان کی شخصیت کے مطالعے میں رہنما بتایا جائے تو بہت سے حقائق ملک سائی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی ذہنیت کے اندر غالب کا شعور اور آہنگ موجزن تھا لیکن جب اس کا اظہار ادبی سطح پر ہوا تو ان کی اتنا آہنگی میں ارتعاش پیدا ہوا اور انہوں نے شعوری طور پر اس حقیقت کو نہ صرف اپنے لئے ایک چیلنج سمجھا بلکہ اتنا کامیاب بنالیا۔ اسی جگہ سے ان کی غالب شکنی کی ابتدا ہوتی ہے اور وہ "یگانہ غالب شکن" کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں۔

یگانہ نقاد نہیں تھے نہ انہیں جدید تنقیدی اصولوں سے زیادہ آہنگی تھی تاہم جب ہم "غالب شکن" جیسے مقالے کا موازنہ دور جدید کے معروف نقادوں نئے غالب شکن انہیں ناگی سے کرتے ہیں تو "غالب شکن" زیادہ معتبر محسوس ہوتا ہے۔ یگانہ نے گہرے حال غالب کی شعری و فکری جہت کے بعض اجزاء کا انکشاف کیا ہے غالب سے ان کی جنگ شخصیت تھی اور اس جنگ میں اگر یہ انہوں نے ہتھیار تو نہیں ڈالے لیکن برابری کی بنیاد پر مصالحت ضرور کر لی۔

آڈ غالب سے دوستی کر لیں وہ بھی استاد ہم بھی اک اُستاد
 • غالب شکن کوئی تنقیدی مقالہ نہیں ہے بلکہ سید مسعود حسن صاحب فری
 کے نام لکھا گیا مکتوب ہے چنانچہ اس میں مخاطب کا انداز اور ذہن میں موجود
 حقیقی احساسات کا برملا اظہار ہوا ہے مکتوب نگار کے لمحے میں لکھنے والے کی
 نفسیات دل مختلف ہوتی ہے اور چونکہ اس کا مخاطب بھی ایک ہی ہوتا
 ہے اور مخاطب سے تعلق خاطر کا پہلو غالب آجاتا ہے اس لئے فکری معنوی
 بندی کا امکان ختم ہو جاتا ہے فرد کے حقیقی محسوسات و نظریات تک سائی
 حاصل کرنے کے لئے خطوط اہم حوالہ بن سکتے ہیں لیکن ہمارے اہل نظر نے اس

ماخذ کی طرف وہ توجہ ہی نہیں دی جس کے وہ متقاضی تھے۔ حال ہی میں حمایت علی شاعر نے اس حقیقت کو محسوس کیا اور اپنے احساسات و خیالات کے ترسیل پر صورت و مراسلہ کی ہے جو کہ ایک اچھا تجربہ ہے۔ لے

یگانہ نے چند باعیاں کہی تھیں جن میں غالب کی ذات کو طنز کا نشانہ بنایا گیا تھا یہ اشتعال ہنوں نے اپنے احباب کو روانہ کئے تھے ان کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ مولے مسعود حسن مٹوسی کسی نے ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ انہوں نے یگانہ مشورہ دیا کہ یہ اشعار شائع نہ کریں جو کہ وجہ اختلافات ہوا اور یگانہ کی تحریر غالب شکن کا محکم بھی بنا انہوں نے ایک اصول کی حیثیت سے بہت صحیح بات لکھی ہے۔

بیرامد مہب غالب پرستی نہیں ہے بلکہ خود پرستی یا حق پرستی۔

خود پرستی کیلئے یا حق پرستی کیلئے

آہ کس دن کے لئے یا حق پرستی کیلئے (یگانہ)

دوسری ضرورت ان ظریفانہ باعیوں کی یہ ہے کہ غالب پرستوں کی دیوانہ وار عقیدت اور بھٹی ہوئی ذہنیت پر کچھ چوٹ تو پڑے ذرا اپنے حواسوں میں توازن ملے۔

اُدو کے ادبی مورخوں اور مبصرین کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ پرستی و اُردو کے درمیان امتیاز نہیں کر سکے اور اکثر داد و تحمیں کا وہ انداز اختیار کر لیا جو فرد پرستی کے بھائے فرد پرستی پر تمام ہوا۔ اس غلطی کا سب سے پہلے ارتکاب کرنے والوں میں محمد حسین آزاد کا نام آتا ہے جنہوں نے ذوق جیسے عالم شاعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا اس کے بعد عبدالرحمن بجنوری نے بھی کچھ غالب کے لئے کر دکھایا اور اب یہ سلوک اقبال کے ساتھ جو رہا ہے۔ یگانہ نے ذرا سخت لہجے میں اس رجحان کی گرفت کی ہے جو کہ معنی و مقاصد کے اعتبار سے بجا نہیں ہے کیونکہ اس سلوک سے فرد کی شخصیت

اور اس کی اہمیت و حرمت میں اضافے کے بجائے اس خطاط و اجتذال کا عمل واقع ہو جاتا ہے کسی کو کسی پر مسلط کر دینے کی کوشش ہمیشہ ایک منفی رد عمل کا سبب بنتی ہے۔ اردو کے بڑے شاعروں میں میر وغالب اور فیض کی پذیرائی عام کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے اپنے انتخاب کے ذریعہ ان شاعروں کو اپنے غلامانہ میں شامل کیا۔ یگانہ کہتے ہیں کہ غالب کیلئے زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال و دقت پسند شاعر اور یہ کہ کراہنوں نے شاعر کو اپنے شعور و لاشعور میں خود ہی اُتار لیا ہے یہ ایک ہی جملہ اعتراضات کی سہ بن جاتا ہے البتہ اس جملے کے ساتھ ہی ان کی آواز اور قوتِ رد عمل جاگ پٹتے ہیں چنانچہ دوسرے جملے میں وہ کہتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ آخر کی چند باعیاں رو ہی جن میں غالب پر تمسخر کیا گیا ہے، شائع نہ کی جاتیں تو اچھا تھا! انہیں شائع کر کے گویا میں نے اپنے یہی خواہوں کا (یہی خواہ بقول آپ کے) دل دکھایا ہے۔ خیر یوں ہی ہیں غلط بینی یا غلط فہمی کے سبب کوئی آپ جیسا کھا جائے تو اور بات ہے ورنہ مجھے دل دکھانے کی ضرورت کیا تھی البتہ یہ آزمانا ہے کہ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔

جو بسا اوقات اپنے خیالات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ جن وہ پہلے سرے کا بے مراعہی ہے ہلنا چڑھنا جوہ کے ساتھ گونگا بھی ہے مضمون چرانے کو جراتا ہے مگر مضمون نہیں کر سکتا تصرف کی قدرت نہیں رکھتا جو ہی کھل جاتی ہے زبان ایسی گونگی کہ نفسِ مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ شوقِ شاعری کے تک بندی کر لیتا ہے۔

غالب پر مضمون چرانے کا الزام یگانہ کے جذبہ مخالفت پر اُٹے مخالفت کی نشاندہی

کرتا ہے۔ غالب فارسی کے ان شاعروں میں ہیں جو شعری تاریخ میں موزوں مرتبہ رکھتے ہیں مگر اس میں ہر بات کے سیرے سے ان کی فارسی گوئی کا برملا اعتراف کیا تھا۔ ایک اہل زبان کا یہ اعتراف ایک ہندوستانی کے دعوے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ غالب صدی ۱۹ء کے موزوں پر ایران کی وزارت فرنگ و ہنر نے شہنشاہ ایران کی ایما پر ان کی فارسی کلیات شائع کی تھیں کسی خیال یا موضوع کا دہرایا جانا ذہن کا ایک لاشعوری اور فطری عمل بھی ہو سکتا ہے ایک ہی خیال یا موضوع کسی ایک عہد یا فرد کا پابند نہیں ہو سکتا ہے مختلف زبانوں میں بھی انسانی تجربات اور وارداتیں ایک جیسی ہو سکتی ہیں فرق صرف اسلوب اور انداز کا ہوتا ہے۔ فیض کے یہاں ایسے شعر ملتے ہیں جن میں میر و غالب کے موضوعات دہرائے گئے ہیں کیونکہ یہ موضوعات فیض کے عہد میں بھی اتنے ہی اہم اور تروتازہ تھے جتنے کہ اسٹاروین اور انیسویں صدی میں تھے لیکن فیض کا شعر غالب کے اسلوب کا مقابلہ نہ کر سکا ہے

ہم پرورش لوح و قلم کرتے ہیں گے۔ جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے ہیں گے۔ فیض کہتے ہیں جنوں کی حکایات خونِ بکلیں۔ ہر چند بلخ اس میں ہمارے قلم بولے۔ غالب یگانہ بھی غالب کی طرح ناقد ہی سخن اور عدم اعتراف کے کرب میں مبتلا ہے۔ ان کے لاشعور میں یہ تنہا موجود تھی کہ زمانہ ان کو جانے اور پہچانے ان کی خواہش نہ تھی اور جانو تھی انہوں نے اپنے شعروں میں جو نقطہ نظر اور موضوعات پیش کئے تھے ان کی معنوی اور عصری اہمیت مسلم ہے ہر شاعر تخلیق کار اور اہل نظر اپنے افکار و نظریات کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے یہ بالکل فطری اور صحیح جذبہ ہے تہذیبی و تاریخی اعتبار سے بلند اور پختہ معاشرے پر بھی یہ فرض مائد ہوتا ہے وہ اپنے نئے افکار و نظریات سے استفادہ کرے لیکن پھر اپنی تاریخی و تہذیبی سر بلند عہد کے باوجود اس عمل میں بہت نا اہل ثابت ہوا، کیونکہ یہاں علم کا ہمیشہ فقدان رہا اور بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں میں

بہی تعلیم عام کی فی صد شرح معمولی ہی رہی۔ اردو شعروادب کی ایک بد قسمتی یہ بھی ہے کہ اس نے عوام کی زبان ان کے بچے اور معیائے سے ہٹ کر اپنے لئے زبان و بیان اور فن کے جو پیمانے مقرر کئے ہیں انکے ماخذ یا تو عربی و فارسی ہے یا امرائے و شرفاء کی محدود دنیا یعنی اردو ٹٹے معلیٰ کی دنیا چنانچہ عام زندگی اور تہذیب سے اس کے رابطے کبھی مضبوط ہو ہی نہ سکے۔ یگانہ اس مصری حقیقت سے لاتے ہی بے خبر تھے جتنے کہ ہمارے کلاسیکی اساتذہ۔ انہوں نے کالج کے

مجھے دشمن و دوست کی پرواہ ہوتی تو ایسا کیوں کرتا، مگر ملک خود اپنی قوت فیصلہ کو مجروح کئے لیتا ہے یہ کون سی عقلندی ہے
میں غالب کی طرح داد سخن کا بھوکا نہیں ہوں کہ لوگوں کو متحار کر
چمکار کر اپنے ڈھپ پر لاؤں یا یہ کہوں کہ!

نہ ہوں گے مرے اشعار میں معنی نہ ہو۔

اس طنزیہ فقرے کے پس پشت کبھی وہ احتجاج موجود ہے جو یگانہ اپنے
ناقد ری پر کر رہے ہیں تحلیل نفسی بھی اس کی نشاندہی کرے گی۔ غالب کے سلسلے
میں اس مصرعے کے جو معنی انہوں نے اخذ کئے ہیں صحیح نہیں ہیں کیونکہ غالب
اپنے عہد کا وہ انسان تھا جس کو اس دور کی بہت زیادہ گہری ہوئی فکری سطح
کا اچھی طرح علم تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آنے والے دور میں علم و ادراک کی
تسطیح پیدا ہوگی جو اس کے افکار و نظریات کو سمجھنے کی اہل ہوگی۔ فارسی اور اردو
دو لٹریز زبانوں میں اس نے مستقبل کی اس صورتحال کا ذکر کیا ہے۔

کو کم رادر عدم اوج قبولی بودہ آ
شہرت شعور بہ گیتی بعد من خواہد شدن
ہوں نغمہ نشاط و تصور سے نغمہ سنج
میں مندیب گلشن ناآسردیہ ہوں

جس معاشرے میں ذوق اور ظفر جیسے اساتذہ ہوں وہاں غالب جیسے
بدلت پسند و روایت شکن فلسفی کے افکار و نظریات کی پذیرائی کا کیا امکان
ہو سکتا تھا اور اس قسم کے معاشرے میں اس سے بہتر اور کیا جواب ہو سکتا تھا۔

گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی تک نہیں

ماقدوری زمانہ کے خلاف لیگانہ کار و عمل اتنا شدید ہے کہ وہ شکایت میں بہت زیادہ ذاتی اور متبذل سطح پر آگئے ہیں اور ان کا ہجو علی وادلیسہ حدوں سے بڑھاؤ کر گیا ہے یہاں بھی وہ اپنے حریف غالب کے مقابلے میں کمزور دکھائی دیتے ہیں جو درگزر کے معاملے میں فراخ دل واقع ہوا تھا۔

کمال تو وہ شے ہے کہ مار کھوسنوں کے داد و وصول کر لیتا ہے پھر ضمیر فروشی کرنے یا تالیف قلوب کی منافقانہ پالیسی برتنے کی کیا ضرورت ہے۔ داد تو مجھے ایسی ملی کہ زمین و آسمان گواہ ہیں۔ سارا کھٹکوا جزا کر میرے بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گیا سامنے آنا نہ دکھانا چھوڑ دیا ذرا غور تو کیجئے اس سے بڑھ کر اور کیا داد ہوگی؟ بائیکاٹ کا فلسفہ یہی تو ہے کہ روزِ ہوا دشمن جب سرِ طرح عاجز آجاتا ہے کوئی کاٹ نہیں کر سکتا تو بائیکاٹ کے حربہ پر اتر آتا ہے خدا جانتا وہ میرے کون سے قدر وادوں ہیں جو نفسِ کمال کو غالب پرستی کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں۔ یہ اچھی مشروط ہے کہ میں غالب کی شان میں ایسی رباعیاں نہ کہتا اُن کے عیب کو ہنر سمجھتا یا کم از کم اس کے عیب کو چھپانے رکھتا تو میرا کھپا اُپھٹتا اور نہیں تو نہیں۔

(عزیزِ دلیلیقی مرزا انیم بیگ چغتائی اسی ہاتھ پر ایک دن اپنے عم محترم جناب مرزا ابراہیم بیگ صاحب قبلہ سے لڑ پڑے کہ غالب کیا ہیں مرزا ایگانہ تو حضرت عمر اور حضرت ابو بکر کو بھی نہیں ملتے تو اس سے کیا نفسِ کمال پر کوئی زوال آ سکتا ہے اگر یہی ہاتھ ہے تو کیا آپ اپنے خفیہ عزیزوں سے رشتہ قطع کر لیں گے؟ اس پر جبکہ قبلہ (میرے برادر عزیز مرزا انیم بیگ صاحب چغتائی کے والد محترم) ایسے خوش ہوئے کہ فاکسدار کی مدد میں ہرجستہ چند اشعار لکھ ڈالے

جس کی ابتداء اس شان سے فرماتے ہیں۔ عجب
 "فرید وقت ہیں یہ میرزا یگانہ بھی۔"

"ماں کلام غالب کے منظر میں غالب ہی کا غلبہ ہے جبکہ مصنف پرشے
 کے پیچھے مصروف تماشا ہے۔ غالب شکن میں یگانہ مرد میدان ہیں اور غالب
 پس پردہ ہیں۔ غالب شکن کا مصنف اپنے آپ کو پہچانا چاہتے ہیں اور
 وہ بھی زیر کستی۔"

باوجود ان عیوب کے جو مجھ میں، میں ملک میں ایک ایسا
 ہے تعصب تعلیم یافتہ طبقہ بھی موجود ہے جو مجھے دوست رکھتا
 ہے ہنر کو ہنر کی حیثیت سے دیکھتا ہے غالب پرستی کے ساتھ
 مشروط نہیں سمجھتا تھا جانے یہ مشروط قدر دانی کیا بلا ہے ؟
 آل انڈیا شاعر کانفرنس کا بنور میں اگر کسی شخص نے میرے اس
 مصرع کو (وہ کون یگانہ ؟ وہی غالب کے چچا) نقل کر کے حاضرین
 جلسہ کو بھڑکایا تو اس کی شکایت کیا۔ اس کی نگاہ بدین کا
 تقاضا یہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ "تراشہ" کے تمام صفحات میں
 آخر کی انہیں پانچ سات مزاحیہ رباعیوں کو کتاب کا ماحصل سمجھتا
 ہے کتاب کا اصل موضوع اس کے نزدیک یہی چند رباعیاں ہیں
 یا کم از کم لوگوں کو ایسا باور کرانا چاہتا ہے تو اس سے میرا آپ کا
 کیا بگڑا ہاں ادبی دنیا کو اس نے دھوکا دیا۔

ان تمام حربوں کے باوجود ان کے لاشعور میں موجود غالب ایک باز پرس
 شعور میں آجاتا ہے اور وہ بڑے سلیقے سے اس کی سر بلندی کا اعتراف کرتا ہے۔
 کیا غالب کے لئے یہ شرف کافی نہیں ہے کہ آخر عمر میں دبیر نقی
 میر کی اقتضا کی بدولت وہ اک کامیاب شاعر تھا۔

غالب کے طرفدار نقادوں کی جس کوتاہی کی طرف صاحب غالب شکن نے

شمارہ کیا ہے وہ اسلوبی اعتبار سے زیادہ غلط نہیں ہے۔ دراصل اس کے نادران عقیدت مندوں کے لئے وجہ توجہ ہے جو اتنے بڑے شاعر کی شخصیت و کردار کو مسح کر دینے کے لئے دیوانہ وار سرگرم عمل ہیں۔ ان نادان لوگوں نے اس شدید رد عمل کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں جو وقت کے ساتھ مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے۔

کیا غالب کی صحیح و جائز تعریفوں سے یاروں کو ہمت نہیں بھرتا کہ اسے ناممکن معراج یا 'اچھا لانا' کہتے ہیں یہ کیا غلط کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا یہی اہتمام ہونا ہے کہ غالب ہائز مدح جس عزت کا مستحق ہے وہ سب اس سے چھین جائے اس کی شاعرانہ بے ساختہ اور اس کے کیریکچر کی حقیقت سے جا پہنچ شروع ہو جائے اور آخر کو ہوا بند کا یہ طلسم تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ جائے۔ غالب پر ستوں کے دیوانہ وار عمل کا رد عمل شروع ہو چکا ہے کچھ دغوں میں ثابت ہو کر رہے گا کہ غالب کو اردو زبان کا دوسرا نادر مہر ان اس کے کلام کو

سراسر انبیا می ————— سبہ زان فارسی ستر پھر سے

اجوئی لب واد صد فدا ہے پونکہ وہ ندری کے سوا اور کوئی زبان جلتے ہی نہیں تھے۔ یہ غیر کی کا نتیجہ ہے جو شش عقیدت کے قریب کارمیت اور کچھ بھی نہیں۔

یہاں پر حال غالب دشمن بہ کثرت ہیں جن کو غالب مہتمم غالب شناس اور غالب پسند ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر کو 'ناب شنک' کا عنوان دینا ہی غلط ہے۔

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی شاعری کی نسبت لوگوں سے بہتر رہاؤں؟ کہنے اور ہر دعوے کرنے کی پوس میں تعلیم یافتہ گراہوں کی طرح مہمات غالب کو بھی آسانی صحیفہ مان لوں اور اس طرح غلط ہدستوں کی نگاہ میں جمہوری اور ذلیل عزت حاصل کروں، کیا ایسی عزت کو جو ایک قسم کی سبک داری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

میرزا شاد کے کوئی قصہ نہ مل سکا۔ ان کی فنونِ کرم سے ہے۔ شصت و چھ سو کے زمانہ میں
 ایک عرصے کو جو وہ سب کچھ کے حصہ میں حاصل ہو۔ عرب و عجم میں
 جسے عرب کہتے تھے۔

میر کا منصب یہ نہیں کہ غالب نے صحیح مرتبے سے گھٹ جاتی ہیں
 گئے۔ وہ مزاح و ہجو پر جو سماں خلعت خواہ خواہ یا اردو نے پہنا دیا
 ہے وہ کڑے کاغذ۔ عین نے غالب کے ناقص اشعار پر (جو کاغذ
 کڑھیک کر کے ڈالیں) فضول حاشیہ آدائیوں سے جس بد
 کو راج دیا ہے اور تعظیم یافتہ گراہوں نے اردو کی دنیا میں خطا الرجال
 کی غرض محسوس کر کے خواہ خواہ غالب کے سوا لگ بنا کر یونان و جرمنی کے
 فلاسفوں سے بھر دینے کا جو مضحکہ انگیز خیوہ اختیار کیا ہے اس
 کی ٹھیک نکلنے ہی کو ہے میر نے گزشتہ بیس سال کے دوران میں سے
 مختلف مضامین کے ذریعے سے غالب کی شاعرانہ کج مزاج پہلو پر روشنی
 ڈالنے کے سوا ان کے کچھ کچھ سے زیادہ محنت نہیں کہ جس پر خود ان
 کے مستوبات اور قصائد وغیرہ سے روشنی پڑتی ہے۔
 غالب سے تقرب اور غالب ثانی ہونے کی سمت ہی ریکانہ سے اس قسم
 کی عبارت نکھواتی ہے۔

آیات و جہانی اور ترانہ عالم شہود میں آپ کا ہے غالب کے آسمانی
 صیغہ کا بحر کھلتا ہوا ہے ہوا جہاں کو اب سمجھنے کے چیمچے چیمچے
 پہلنا ہوتے گا برا بر چلنے کا موقع نہیں۔

قانع ہر بان تو غالب کی بد زبانی اور بد کلامی کی روشن مثال ہے
 اس کا کیا کہنا؟ غالب کی دیکھا دیجی جیسے سب کسری کسری سنا دینے
 کی عادت پڑ گئی۔ اس معاملہ خاص میں مجھ پر غالب ہی کا پر تو پڑا
 ہے۔ لوگوں کو میری اس عادت سے نفرت ہے اور ہو ہی چاہیے تو

غالب سے اردنیادہ نفرت ہوتی چلی بیٹے کہ وہ اس فنِ تبلیغِ لسانی کے
امام ہیں۔

قاطع برہان کی تنقید اور اس حوالے سے بد مذہبی کا یہ الزام محض الزام ہے۔
قاطع برہان پر غالب کی تنقید علم لسانیات کا ایک اہم باب ہے یہ صحیح اور سائنسی
تنقید تھی جس میں انہوں نے لفظ کے لغوی اور مرادی معنوں کو موضوع بنایا تھا۔
"غالب شکن" میں مصنف نے غالب کے معروف مذاکرہ عبدالرحمن بھنوری پر سخت
تنقید کی ہے اور اس تنقید میں معقولیت کا پہلو بھی موجود ہے۔

یورپ کی ذہنی روشنی میں غالب کو دیکھنا غلط اصول ہے جیسا
یورپ کی فضا سے غالب کے ذہن کو کیا تعلق۔ غالب کی نشوونما
ہندوستان میں اور ایرانی لٹریچر کی فضا میں ہوئی۔ فارسی لٹریچر کی
روشنی میں غالب کے کام پر صحیح تنقید ہو سکتی ہے۔ یورپ کے فلاسفوں
سے سببِ انا محض ایک غفلانہ بوائے جی ہے۔ غالب پر حاشیہ آرائی کرنے
والے فارسی لٹریچر کو تو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ فارسی لٹریچر کو
سامنے رکھ کر تنقید کرتے تو کہیں دیوان غالب کو آسمانی صیغہ یا سراسر
الہامی یا اور بچل نہ کہتے۔ غالب زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک
بلند خیال وقت پسند نگراہ شاعر ہے جو آخر عمر میں راہ پر آ یا مگر
صبح کا سہولہ شام کو آئے تو گئے سہولہ نہیں کہتے۔ صوفی اور وطن پرست
کا غفلت پہناتالو نہایت مضحکہ خیز عقیدت مندی ہے۔

اصولی اعتبار سے یہ بات آج اتنی صحیح ہے جس قدر کہ دیگانہ کے دور میں
تھی ہمارے بعض معروف و اہم نقاد جو انگریزی زبان و ادب سے ماؤس ہیں۔
جنہ ضروری حد تک اردو شعر و ادب پر اس کو مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور

صاف محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی انگریزی دانی کی اظہار اپنے قارئین کو دیتے ہیں اور پھر جب قارئین عبدالودود صاحب جیسے ہوں۔ ٹی ایل ایس او نیوز ویک و ٹائمز میں شائع ہونے والے معلوماتی مضمونوں سے معلومات کو جمع کر کے تسلسل کے ساتھ اردو میں لکھنا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے جس کی اس طرح داد و تحسین کی جائے۔ غالب نیکن غالب پرستوں کے لئے لکھا گیا ہے نہ کہ غالب کے لئے۔

غالب کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنا پڑی۔ ورنہ مجھ سے اور غالب معذور سے مخالفت و مخالفت کا کوئی موقع ہی نہیں ہے وہ انیسویں صدی کے پاس میں بیسویں صدی کا۔ میں کہتا ہوں اور کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تعلیم یافتہ مگر ہوں کی بہ نسبت غالب کے کمال اتنا شعری کی صحیح قدر شناسی کا جو ہر فطرت نے مجھ میں زیادہ ودیعت کیا ہے شاعر کو بہ حیثیت شاعر شاعری بہتر سمجھ سکتا ہے۔ مگر ضرورت خاص غالب کے متعلق اس قدر تلخ حقیقتوں کا انکشاف اس لئے جائز سمجھتا ہوں کہ غالب پرست ذرا حقیقت تلخ کا مزہ بھی چکھ لیں کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ کئے گئے ہو چکے ان کی غلطی کمزوریوں کو بکھانا سخت کم ظرفی و خباثت کی دلیل ہے۔ کیا مجھ میں وہ کمزوریاں نہیں ہیں جو انسان میں ہوتی ہیں۔ مگر میں کیا کروں میں اسے ادبی خدمت سمجھ کر منسوری سمجھتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری یہ تلخ نوافی کسی مخالفانہ جذبہ کے تحت ہے یا اس میں کوئی اصلاحی اسپرٹ پوشیدہ ہے۔ آپ غالب اتنا ضرور سمجھتے ہوں گے کہ میری ان تمام تقریروں کا مخاطب غالب نہیں ہو سکتا کیونکہ گفتگو مردوں سے نہیں ہوتی زندوں سے ہوتی ہے اس کے علاوہ

اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے کہ مرزا غالب نے خود اپنے (الموت
 برہان قاطع) پر نہایت سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے مجھ سے
 زیادہ غالب پر سخت کلامی یا بد اخلاقی کا الزام کھپ سکتا ہے۔
 دو سرے وجہ میرے اس بے کا نہ لب و لہجہ کی یہ بھی ہے کہ غالب پڑ
 نے غالب کی مدح میں حد سے زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ تمام
 اساتذہ اُردو کا حق تلف کر کے غالب کو فنی ٹیپ ہے۔ مگر میں نے
 غالب کا حق تلف نہیں کیا۔ ہاں کھری کھری سنا دی جس کے
 مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست۔
 خیر چند رہا عیوں پر اس قصہ کو ختم کرتا ہوں۔ یا زندہ صحبت باقی ہے

۵

غالب کے دیوان

تحقیق کا منصب یہ نہیں ہے کہ ہم دریافتوں اور ان دریافتوں کی معاونت کرنے والی دلیلوں کو مجتمع کر لیں بلکہ تحقیق کا حقیقی مقصد تمام دریافتوں کو یکجا کر کے انہیں تضادات سے پاک کرنا ہے۔ تضادات کو ختم کر کے یکسانیت (Harmony) پیدا کرنا اور غنائی کو ممکنہ حد تک متعین کر دینا تحقیق کا اہم ترین مقصد ہے۔ اردو زبان کے آغاز و انقلا سے متعلق منطق و دلائل اور مباحث کے بعد متعدد فیصلے کئے گئے ہیں، مجموعی اعتبار سے ان سائے فیصلوں میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس قدر طویل مباحث کے باوجود ہماری ادب کا محقق یا طالب علم قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان کس آغاز و ارتقاء کا مرکز — — — کہاں ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے بعد سب سے زیادہ تحقیقی مطالعہ مرزا غالب کا ہوا ہے۔ لیکن یہ مطالعہ بھی تضادات کا جنگل دکھائی دیتا ہے۔ دو ادیبین غالب کے مستند نسخوں کی فہرست میں گیارہ نسخوں کا ذکر ہے۔ اولین نسخہ بھوپال بمطابق غالب ۱۸۱۶ء، نسخہ بھوپال جدید ۱۸۶۱ء، نسخہ شیرانی ۱۸۲۵ء، نسخہ گل رعنا ۱۸۲۹ء، نسخہ رام پور قدیم ۱۸۴۳ء، نسخہ بدایوں ۱۸۳۶ء، نسخہ پٹنہ ۱۸۴۵ء، نسخہ لاہور ۱۸۵۲ء، نسخہ رام پور جدید ۱۸۵۵ء، نسخہ انتخاب غالب ۱۸۶۶ء اور نسخہ مظاہر لاہور ۱۹۳۶ء۔ ان تمام نسخوں اور بعض بیاضوں کو سامنے رکھ کر مولانا عرش نے دیوان غالب کا ایک جامع ایڈیشن موسوم بہ نسخہ موشی ۱۹۵۱ء میں رنجن ترقی اردو ہند نے شائع کیا ہے مولانا عرش نے اپنے دیوان کی ترتیب

کے وقت غالباً غالب کے اولین دیوان نسخہ سہو پال بخط غالب سے استفادہ نہیں کیا ہے جبکہ یہی دیوان غالب کا اولین دیوان ہے اور چونکہ بحفظ غالب تحریر ہے اس لئے نہایت اہم بھی ہے ڈاکٹر ابو محمد سحر کی تحقیقی کاوش کے بعد اس اہم نسخہ کا پس منظر سامنے آیا ہے اس نسخہ کا سن کتابت ۱۸۱۶ء ۱۲۳۳ھ ہے ابو النصر خالہ کی تقویم کے اعتبار سے ۱۲۳۳ھ بالکل صحیح ہے کیونکہ انیس سال کی مدت میں ہجری اور عیسوی سنیں میں دو سالوں کا فرق ممکن ہے البتہ انیس سال کے عرصے میں دو سنیں کامساوی رہنا ممکن نہیں ہے۔ مولانا عوشی نے سن کتابت کا تعین ۱۲۳۳ھ کیا ہے اور انیس سال کے عرصے میں دو دن سنیں کو مساوی رکھ کر حساب کیا ہے چنانچہ ۱۲۳۱ھ مشکوک ہے لہ ۱۸۲۱ء میں مرزا نے اپنا ایک دیوان ردیف کی ترتیب سے صاف کروایا تھا۔ اس نسخہ میں ۱۸۲۱ء سے قبل کے اشعار شامل نہیں تھے۔ ان میں وہ اشعار بھی تھے جو اولین دیوان میں قلمبند ہوئے تھے لہ مولانا عوشی نے اپنے نسخہ میں — منسوخ کلام نقل کیا ہے وہ اولین دیوان سے نہیں بلکہ منتخب عیار الشعراء اور قدیم اخذات سے نقل کیا ہے نسخہ سہو پال بخط غالب اس حصہ کے کلام کا مجموعہ ہے جب مرزا اسد تخلص کرتے تھے اور طرز بیدل میں ریختہ کہتے تھے اس دیوان میں اکثر اشعار بیدل کی پیروی میں ہیں لیکن بعض اشعار سادہ و بامعنی ہیں۔ اس تضاد سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا اس زمانے ہی میں طرز بیدل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش کا نتیجہ وہ انتخاب ہے جو ۱۸۲۱ء میں مرتب ہوا۔

لہ غالب کا سن پیدائش ۱۷۹۷ء، ۱۲۱۲ھ ہے۔ اولین دیوان انیس سال کی عمر میں لکھا گیا ہے۔ مولانا عوشی نے عیسوی اور ہجری سنیں میں ایسے جمع کر کے ۱۸۱۶ء ۱۲۳۱ھ کا تعین کیا ہے۔
 لہ نسخہ سہو پال بخط غالب۔

نہ کی چشم حصول نفع صہیتہائے مسک سے : رنگ بیدل

ابریشم ساز موئے جہنم ہے مجھے : رنگ بیدل

دیکھا نہیں ہے ہم نے بہ عشق بتاں اسد : حیزار شکستہ عالیٰ خوشتر کشیدگی اساد

عرب سر پوشش نہ یکجا ہوئے میرے کہ اسد : میں پرستندہ لڑنے صنم چند لہجہ محنی

قدیم نسوخی کی مدد سے جو مستند دوا وین طبع ہوئے ہیں ان میں نسوخر برلن بھی

ہے۔ غالب پر ہونے والی تحقیق میں نسوخر برلن کا کوئی ذکر نہیں آتا ہے۔ محو انصاری

نے انکار غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں اشعار نابرن ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر فاکر حسین کا نام کا ما

ہے۔ نادم سیتا پوری نے اپنی تعریف لکھ کے متن میں سرسری طور پر نسوخر برلن کا ذکر

کیا ہے برلن ایڈیشن کا جو نسوخر میری نظر سے گزرا ہے اس میں کسی مرتب کا نام

نہیں ہے۔ جہیں سائر کا یہ ایڈیشن خود بصورت مصری ڈاکٹریٹ میں برلن سے ۱۹۴۲ء میں

طبع ہوا تھا۔ اردو کے لیے تمام حروف جن کے ساتھ ۰ ط کی حرکت شامل ہے چار

لفظوں سے بدل گئی ہے مثلاً ٹ کی جگہ ث اور ڈ کی جگہ ژ۔ اس ایڈیشن میں مرزا کے

ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ شامل ہے جس کے آخر میں ۱۲۴۵ھ لکھا ہے۔

نیا ادارہ لاہور نے اپنے ایڈیشن میں اسی دیباچے کو نقل کیا ہے نسوخر برلن میں جس نقوی

کو شامل کیا گیا ہے جرمنی کی ساخت ہے اور قیاس پر مبنی ہے لیکن یہی تصویر بعد میں

منقول ہوئی۔ حالانکہ غالب کی حقیقی تصویر وہ ہے جو رحمت فوٹو گرافر نے مرزا کی وفات

سے کچھ پہلے تیار کی تھی۔ دیباچے کے حساب کو اگر بنیاد بنایا جائے تو نسوخر برلن نسوخر برلن

کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے جس دیباچے کو نسوخر برلن میں شامل کیا گیا ہے غالباً

نسوخرام پور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نسخے کو مرزا نے ۱۲۴۲ھ میں صاف کر دیا تھا۔

ترتیب کے اعتبار سے نسوخرام پور کو تقدم حاصل ہے لیکن نسوخر برلن کی ترتیب

۴ " غالب کے کلام میں اطلاق عناصر "

۵ جامعہ ملیہ کالج لیکچرر اچ کی مرکزی لائبریری کی ملکیت ہے۔

۶ یہ عزائم نقلہ معلنی کے مشاعروں میں سنائی گئی تھیں۔

نسخہ دہلی پر سے بہت مختلف ہے چنانچہ نسخہ برلن دہلی کی نقل نہیں ہو سکتا۔ نسخہ بدایوں کا اصل منظوم یا اس کی نقل ہمارے سامنے نہیں ہے دوسری جانب نسخہ برلن میں ایک غزل: ”باز سچو اطفال ہے دنیا میرے آگے“ اور دوسری غزل: ”بہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں“ بالترتیب ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۵ء کے عرصے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ نسخہ برلن کو نسخہ بدایوں کی نقل بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دلائل و ماخذات کی عدم موجودگی کا مسئلہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن آئنا ضرور کہا جاسکتا ہے نسخہ برلن کسی نہ کسی منسوب دہلی کی نقل ضرور ہے برلن ایڈیشن میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو مروجہ دواوین میں نہیں ہیں۔ اور ایسے اعتبار بھی ہیں جو مروجہ دواوین سے مختلف ہیں غالب کی ایک غزل جو ردیف تکیہ میں ہے اور ۱۸۶۵ء میں امین الدین کی فرمائش پر خط میں قلمبند ہوئی ہے لیکن یہ غزل ان تمام نسخوں میں بھی ملتی ہے جو ۱۸۶۵ء سے قبل لکھے گئے تھے اس مسئلے پر بھی تضاد ملتا ہے مثلاً نسخہ طاہر کے ترتیب صفحہ ۳۳ پر لکھتے ہیں کہ محولہ بالا غزل، ایک دہلی کے یہاں نقل نہیں ہوئی ہے جبکہ تادم سینا پوری صفحہ ۲۵۱ کے مطابق مالک دہلی نے صفحہ ۲۸۷ تا ۲۸۸ پر یہ غزل نقل کی ہے۔ الفلاک کی نشست و برخواست کے اعتبار سے بھی مختلف دواوین میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کی مثال ذیل ہے۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں	برلن ایڈیشن
یاد ہیں وہ دن تجھے غالب کہ وجد ذوق میں	نسخہ طاہر
یاد ہیں اے ہم نشیں وہ دن کہ وجد ذوق میں	نسخہ حمید
اے تیرا غمزہ یکس قلم انگریز	نسخہ طاہر اور نسخہ حمید
اے تیرا جلوہ یک قلم انگریز	نسخہ برلن
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھایا رب	نسخہ برلن
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھایا رب	مروجہ دواوین

۱۸۷۵ء مولانا عیشی کے مطابق الحاقی شعر ہے۔

غلام رسول پتھر کہتے ہیں کہ شعر ذرا کہ دور سینے سے کہ تیر پرستم نکلے کسی مستند
 نسخے میں نہیں ملتا لیکن نسخہ برلن میں یہ شعر موجود ہے البتہ سینے سے نکلے جہانے سینے
 پر نہ کھا گیا ہے ذرا کہ دور سینے پر کہ تیر پرستم نکلے ہے

زیر نظر جائزہ سے غالب کے دواوین اور الفاظ کی نشست و برخاست کے معاملے
 میں تضادات کا پتہ چلتا ہے اور خود محققین غالب کے متعین کردہ نتائج بھی اختلاف
 سے خالی نہیں ہیں۔ غالبیات کا موضوع ایک مستند، مکمل اور جامع تصنیف کا ہنوز
 انتظار کر رہا ہے ایک ایسے مکمل دیوان کی بھی ضرورت ہے جس میں مرزا کا صحیح کلام،
 منسوخ کلام اور الحاقی کلام یکجا کر دیا گیا ہو۔ الفاظ و تراکیب کی نشست و برخاست میں
 فرق کے مسئلے کا بھی کوئی مستقل اور متفقہ طور پر قابل قبول راستہ متعین نہیں ہو سکا
 ہے۔ مولانا عروسی نے ممکن حد تک مکمل اور جامع دیوان مرتب کرنے کی کوشش ضرور
 کی ہے لیکن اس نسخے میں نسخہ جموں والی بخط غالب کے کلام کا کچھ حصہ نقل نہیں ہوا
 ہے جس کی بناء پر نسخہ عروسی بھی نامکمل رہ جاتا ہے۔

۶ دستنبو

مسلم برصغیر کا ہر زمانہ تاریخ سازی اور تاریخ نویسی کا زمانہ رہا ہے لیکن جدید علمی اور تاریخی نقطہ نظر کے آئینے میں دیکھتے تو یہ تاریخ نویسی علم کے ساتھ مذاق و کھائی دیتی ہے کیونکہ عموماً فاصلہ و قائلے نگار اور تاریخ نویسی محرکوں و دیباہوں اور اُمراء و شرفاء کے قصیدے رقم کرتے تھے ان کے کارناموں ان کے فتوحات اور ان کی ذاتی زندگی کے شاندار معمولات کی تفصیلات جمع کر کے محرکوں اور شرفاء کی مثالی تصویریں بناتے تھے تہذیبی علمی اور ادبی و شعری دنیا کی معلومات کا ماخذ بھی محرکوں، امراء اور شرفاء کی محدود دنیا ہی تھی۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت کو ملک کی سیاست اور اقتصادیات میں کوئی مرتبہ حاصل نہیں تھا اور زبانوں کی شاعری اور تہذیبی زندگی کو لغویت کا درجہ دے کر علم و فکر کی فکر و محاسبہ سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

اٹھارویں و انیسویں صدی میں برصغیر آنے والے بعض انگریزوں اور انگریز تاریخ نویسوں نے مقامی مورخوں کی نااہلی کا ذکر کیا ہے۔ ان لکھنے والوں نے سماجی و اقتصادی حوالوں سے ایسے بہت سے حقائق منکشف کئے ہیں جن میں برصغیر کے محرکوں، امراء اور شرفاء کے اصل چہرے ان کے عجیب و غریب کارنامے اور سیاسی غلطیاں سامنے آئی ہیں عموماً ہماری مسلم مورخین نے ان تاریخی حقائق سے اور سچائیوں کا دریا قدری سے تجزیہ کرنے کے بجائے ان کو انگریزوں کی سیاسی و اقتصادی تعصب پر محمول کیا ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بعض انگریز

ممبروں اور تاریخ لکھنے والوں نے انگریزوں کے سیاسی و اقتصادی مفادات کی بناء پر غلط بیانی سے کام لیا ہے تاہم ہر انگریز مؤرخ کے لئے اس قسم کا تقویٰ صحیح نہیں ہو گا۔ مقامی تاریخ نویسوں کا ذکر کرتے ہوئے ایس ٹی سولے لکھتا ہے:

Most of the native annalists wrote as court flatters, or chroniclers of the achievement of some ruling house. They are not interested in the lives of the poor, the mean, and down-trodden. They did not speculate on or describe the economic structure of the feudal society in which they lived. This defect is true of all histories written before modern scientific research became a serious subject of study dependent of the co-relation of all aspects of a people's culture and their state of civilisation.

The study of social history is in fact a very modern development, which was possible only when the attention of serious minded writers were deflected from the narrow field of the classical writers of antiquity, and when the importance of economic factors in the development of mankind's mission was at least realised.

سارے کے اس بیان میں تعصب یا بے معنویت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ غالب کا زمانہ سیاسی و اقتصادی، علمی و فکری اور تہذیبی و معاشرتی انقلاب کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ان کے وقت تک برصغیر کے کسی مؤرخ نے تاریخ کی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی تھی جو جدید تاریخی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتی ہو لیکن انہوں نے تاریخ پر جب قلم اٹھایا تو شاعری کی طرح اس میں بھی اجتہاد سے کام لیا۔ انہوں نے خطوط میں جو واقعات لکھے ہیں ان کے پس پشت سماجی

دہیاسی اور اقتصادی تہذیبی منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ دہلی کی مام زندگی کے مظاہر پہلی بار اپنی اصل صورت میں حوالہ بنے ہیں تاریخ کے بابے میں ان کا ایک متعین نقطہ نظر تھا اور یہ نقطہ نظر یقیناً برصغیر میں موجود انگریزوں کے اثرات ہی کا نتیجہ تھا چنانچہ سرسید کے مسودے پر انہوں نے کڑی تنقید کی اور آئین الہری کو بے وقت کی رائی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ وہ کوئی باقاعدہ مورخ نہیں تھے تاہم یہاں شاہ ظفر کی نظر ان ہی پر پڑی اور ان کو خاندان تیمور کی تاریخ لکھنے کا مرض سونپا گیا ایران کی بے حد مبہم اور پیچیدہ تاریخ پر بھی انہیں عبور تھا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس موضوع پر اپنی کتاب غالب فکر و فن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

برصغیر میں انگریزوں کی سیاسی و اقتصادی گرفت کے بابے میں غالب اپنا ایک منفرد نقطہ نظر رکھتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد حالی، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد مشہی اور آزاد سب ہی نے اسی نظریے سے استفادہ کیا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ جس زمانے میں غالب نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ان دنوں برصغیر کا مسلم اقتدار اپنے وجود کی قوت کے سائے امکانات ضائع کر کے مفلوج ہو چکا تھا اور برصغیر کی اقتصادی و سیاسی قوت کا توازن انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا انگریزی تہذیب و سیاست اور انتظامی ڈھانچہ مسلم اقتدار کے اس روایتی ڈھانچے سے بددجا بہت تر اور نرو نازہ تھا جس میں اب آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ مٹای نظم و نسق پر انگریز حاوی تھے ان حالات میں اس جہد کا کوئی باشعور اور صاحب بصیرت انگریزوں کے مقابلے میں مسلم اقتدار کی جھڑائی کیوں کر کر سکتا ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ایک اتفاقی گڑبڑ کے نتیجے میں پھوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ پھیل گئی اس کے پس پشت کوئی حامی تحریک یا تنظیم نہیں تھی کوئی مربوط منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی اور رابلوں کے ذریعے اس کے لئے ذہنی

طور پر لوگوں کی کوئی تربیت نہیں ہوتی تھی۔ غالب زمانہ شناس اور آگاہ شخص تھے ان کو اچھی طرح علم تھا کہ انگریزی سیاست اور منظم و برتر فوجی قوت کا مقابلہ مفصل فوجیں کر بھی نہیں سکتی تھیں اس حقیقت سے کبھی وہ بے خبر نہیں تھے کہ برصغیر کے لوگوں کے مجموعی اقتصادی مفادات کی تشکیل کا ذریعہ بہادر شاہ ظفر نہیں بلکہ انگریز تھے ان کے ذاتی مفادات بھی انگریزوں ہی سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علمی و فکری سیاسی و اقتصادی اور تہذیبی و سائنسی تہذیب میں زیادہ برتر ہونے کی بنا پر انگریزوں ہی کو خوش آمدید کہا! ان کی تاریخی دستاویز "دستبنو" میں یہ نقطہ نظر نمایاں ہے۔

"دستبنو" صبیح معنوں میں تاریخ کا جامع مقالہ ہے جو نئے تاریخی شعور کے نشاندہی کرتا ہے معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر اہل تاریخ نے اس مقالے کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ ۱۸۵۷ء کے مجموعی حالات کی نہ جانے کتنی صورتیں ہیں جو اس تاریخی مقالے میں پہلی بار ظاہر ہوئی ہیں ۱۸۵۷ء کا موضوع پر انگریزی میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو میں یہ اپنے موضوع پر یقیناً اولین کتاب ہے ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اس مقالے کے ان اجزاء کو منتخب کر دیا جو غالب کی کردار کشی میں مددگار تھیں لیکن اس کے معن کی ان جزئیات کو نظر انداز کر دیا جو تاریخ میں حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر حسن اختر نے لکھا ہے کہ ان کو انیسویں صدی کے سیاسی و سماجی اور اقتصادی و تہذیبی تناظر میں دیکھنے کے بجائے ۱۹۸۰ء کے بعد والے دور کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ "دستبنو" کا اصل مقالہ فارسی زبان میں لکھا گیا تھا اس کا اردو ترجمہ پہلی بار افکار کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا لیکن نہ تو اس کے بعد یہ کتابی صورت میں منظر عام پر آیا نہ اس پر اب تک کوئی میر حاصل بحث ہوئی ہے اور نہ ہی مؤرخین نے اس کو لائق توجہ گردانتے ہیں چنانچہ دستبنو کے اردو ترجمے کو اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ضمیمہ

دستبنو کا اردو ترجمہ

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء

اس سال جس کا مادہ تاریخی بہ رعایت تخریجہ دستبنو ہے اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۶ لہر رمضان ۱۲۹۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اپنا ملک بلی کے قلعے اور قبیل کی دیواریں لڑا سٹھیں جس کا آخر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں گڑ لڑنے کی بات نہیں کروں گا۔ اس دن جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بد نصیب اور شوریدہ سرسپاہی شہر میں آئے نہایت ظالم و منصف اور جنگ حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے، شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادوں میں ساداش ہو گئی ہو، شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق ملک ہر چیز کو سنبھول گئے۔ ان بن بلٹے یا مدعو کردہ مہاؤں کو خوش آمدید کہا، ان مدہوش سواروں اور انھیں پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اور محافظ ہمان نواز ہیں، دیواؤں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے، جدھر کسی امن کو پایا اور جہاں ان قابل احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے جب تک ان انصروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، ادھر سے رخ نہیں کیا۔ کچھ مسکین گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے، ایسے مسکین و صلح پسند، جو تیر دہر کے فرق سے ناواقف تھے اور

اندھیری راتوں میں چوروں کے شور و غل سے ڈر جاتے تھے۔ جن کے ہاتھ تیرا در تلواریں سے خالی تھے۔ سپرچ پچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے کے گھر کے ہر حصے میں ہیں یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارانے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند و غیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز پہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جاسکتا۔ اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص جنگیں و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

مجبوری و خانہ نشینی

انہیں غمزہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں، میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غل اٹھ اٹھا۔ پتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قلعہ کر ڈیٹھ گئے ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گلی انداموں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویران اور بربادی کے سبب سے بہادوں کا مدفن بن گیا۔

انگریزوں کے قتل پر اظہار افسوس

افسوس وہ پیکر علم و حکمت! انصاف رکھنے والے! خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور خدا افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن غاتو نہیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کبھی چاندنی کی طرح دھمکتے تھے! حیف و نیچے جنہوں نے ابھی دنیا کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے سپوٹوں کو شہر ملتے تھے اور جن کی خوش رفتار سی کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بد نما معلوم ہوتی تھی یہ سب ایک دم قتل و خون کے سمندر میں پھنس کر (بہر فانیں) ڈوب گئے۔

افنا کی، چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں جس کے
 ہاتھوں لوگ غمزہ لہتے ہیں اور مانتی لباس پہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر ان
 مقتولین کے سر ہانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو ردا
 ہے۔ اگر آسمان اس غم میں، اخبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گروہاؤ کی طرح
 اپنی ہلکے چھوڑ دے تو بہا ہے۔

ای تو بہار چون تین بھل بخون بغلت
 ای روزگار چون شب بی ملہ تار شو
 ای آفتاب دئے بسیل کبود کن
 ای ماہتاب داغ دل روزگار تو

اے موسم بہار! بھل کی طرح خاک و خون میں مل جا۔ اے زلزلے!
 اندھیرا دات کی طرح تاریک ہو جا۔ اے آفتاب! (اس غم میں)
 اپنے رخساروں کو پیٹ کر، نیلا کر لے اور اے چاند (عکسین) زلزلے
 کے دل کا داغ بن جا۔

خدا خدا کر کے وہ منوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان
 سیاہ بالٹنوں اور بے جسم تانکوں نے شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرون قلعہ
 شاہی بادخ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ رفتہ
 رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہمسر
 جھاوٹی میں امیروں کو قتل کر دیا ہے (اور ملک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت
 کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار سب یک دلی
 ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لئے
 کمر بستہ ہو گئے اور سچر کسی مضبوطی سے مکر میں کسی خفیہ کے صرف اس دریائے خون
 کی موجیں ہیں ان کو کھول سکتی تھیں جو کھروں سے گزر جائے۔ (مختلف مقامات کے
 لوگ کسی قرار داد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے

اس سے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑوں کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بندے باندھا جاتا ہے اسی طرح گنتی شاہ سے باہر ان لڑنے والوں کے کمرے بھی ایک ہی مکر بندے سے بندھی ہوئی ہے۔

باغیوں کی مذمت

بے شک ہندوستان کو آرام و آسائش سے اس حد تک خالی کرنے کے لئے کہ اگر ان چیزوں کو ڈھونڈا جائے تو ایک گھاس کے تنے کے برابر بھی نشان نہ ملے۔ ایسی ہی جھاڑوں کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو بہت سی فوجیں افیسروں کے بغیر لڑائی کے لئے اسٹھ کھڑی ہوئیں۔ توپیں، گولہ بارود، چھترے غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا، لڑائی کے سامنے طرچے انگریزوں سے نیچے اور انہیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو۔ دل لوہے یا پتھر کا ٹکڑا انہیں ہے۔ کیسے نہ سہم آئے۔ آنکھیں رخنہ دلایا نہیں ہیں کہ آئندہ بہائیں، حکمرانوں کی موت کا حق منانا چاہیئے اور ہندوستان کے ویرانی پر رونا چاہیئے۔ شہر مالکوں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا جیسے بارخ، باغبان سے خالی اور درختان بے ثمر سے پُر ہو۔

لیٹرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد، گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لئے) ، خوانِ مفت، کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گناہی کے گوشوں سے چپے ہوئے تھے وہ گروہ درگروہ خنجر بخت اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں امن پسندی اور نیک نہاد لوگ گھر سے باہر نکل آتے ہوئے راستے میں بیسوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیٹرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ لڑیں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر مہو خواب۔

شرناکی تبہا ہی

بڑے بڑے اعلیٰ خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلائے کے لئے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے، بھجلی چمکنے کے منظر دیکھتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیمانہ کدھر ہے۔

درائے کی اس بے نیازی وجہ امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ جو سارا دن مٹی پیچنے کے لئے زمین کھودتے تھے۔ ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی مغل میں رات میں آتش گل سے چراغ روشن ہوتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و ناامیدی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوٹوالی مشہر کی زن و دختر کے ملاوہ ساری نازنیناں شہر کا زیور بزدل اور یہ کارہنزلوں کے قبضے میں ہے۔ (زیور و آرائش سے محرا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا انداز ناز باقی رہا تھا۔ اس کو ان ناز و دولت گذاروں نے جھین لیا کہ ان کی خود نمائی کے کام آئے جو محبت کرنے والے پہلے نازنینانے گل اندام کی ناز برداری کرتے تھے۔ اب ان بد خصلتوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔


ان بے سرو پا لوگوں کے دماغوں میں حذور اس حد تک سا گیا ہے کہ اگر ان کے خود نمائی کے کام تو معلوم ہو گا کہ کچھ بگڑے چکر کھلتے پھر رہے ہیں اور پچھوٹے ہر وقت اس طرح خود ناز خود نمائی میں محو ہوتے ہیں گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے جیسے چلے جائیے ہیں بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرومندی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت۔ وہ بے اندازہ زرد جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں، جس کا باپ گلیوں کی ناک چھانتا پھرنا تھا۔ وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں چڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے کہیں آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں جو صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور

انصاف کے خواہشمند ہیں۔

درد و دلم کے پیش تو انصاف بخش نیست
چشم ستارہ را مژدہ خوں چکاں دہد
میرا درد سہرا حال مہتابی نزدیک ایک قند ہے اور بس
لیکن اس کو سن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشک خوں جاری
ہو جائیں گے۔

ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رک گئے
ہر کاروں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بھرنے پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی
ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف)
ہے کہ نہ مضارب کی جنبش، بلکہ جنبش مضارب سے، جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔
ہزاروں پیام (خبریں) اندر سے باہر نکلتے ہیں۔

قدر کی مذمت

جو لوگ، مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں، انصاف کو نظر انداز نہ
کریں اور بتائیں کہ اس سامنے انتظام کا درہم برہم ہو جانا خدا کی بخشش ہوئی دولت
کائنات جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا 

نہ غالب کے مطبوعہ نسخے میں اس کے آگے کا حقہ کم خوردہ ہوئی کی وجہ سے پڑے
کے قابل ہیں ہے۔

قیدیوں کی رحمتی

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگ جو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا ہر وارہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے پرانے قیدی جنہوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی شاہی دربار میں آئے۔ سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری یا بھی آقاؤں سے بھاگے ہوئے عین و فساد رفلاموں نے آستان شاہی کا بوسہ دیا اور کسی سر بلند علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا ہے اور یہ بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہش مند کو ملنے ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بواجبی ہے۔

تعباد فوج

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً ۵ ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے صرف شہر کے جانب مغرب۔ ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جنگ پر مدد چہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنالیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اثر دھماکت، رعد و غرش تو پیں لگا دی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالم پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

انگریزوں کی مورچہ بندی

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا، اس میں سے چند توپیں شہر کی فوج پر جہاد ہی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو مرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے توپوں اور ہندوؤں کے دھویں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اگلے برس ہے۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوئی ہے جیسے اوپر سے پتھر برس رہے ہوں، مٹی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے آفتاب برج ٹورہ جو زائیں بے طرح آرتس فروری میں مشغول ہے معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں بھننا جا رہا ہے۔ جو لوگ سرد و ہوا دار مکالوں میں آرام و آسائش کے ساتھ ہتھکتے تھے دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انہیں جلتے ہوئے پتھروں پر پہنچ دتا ہے کہ عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدان جنگ میں ہوتا تو روئیں تھی کہ باد صفا اس کی ہمت و جواں مردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو جی چھوڑ دیتا (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لئے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں بیرون شہر کی داستان شب دروز تو یہ تھی۔ اندرون شہر کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں، ایک دن کا قصہ سننے کے لائق ہے۔

درگ ساد من لڑائی ہست
کہ بھر خولہ انگر اندازہ !
زمین لڑائی شرفشان ترسم
کانش اندر لڑا اگر اندازہ

سرگوستی است ہر زبان کہ زبان
بر من از خویش غنبر اندازد

میرے ساز دل کے تاروں میں وہ فغے پنہاں ہیں
جن سے جنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ
مغنی ان کی نزد میں نہ آ جائے۔ میری زبان پر
وہ داستان ہے جس سے میرے دل پر غنبر
جھٹنے لگتے ہیں۔

ایک شخص جس کے دماغ میں فرماں روائی و تکبر کے خیالات سمجھے ہوئے
تھے۔ درپردہ اپنے آقا اور سرئی کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ اگر یہ
واقف کار اور راز داں زندہ ہے گا تو میں نے جو خزانہ (نا جائز طریقوں سے)
جمع کیا ہے اس کا راز کھل جائے گا: ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا
تھا اور یہ بات مشہور کر کے کہ حکیم حسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ اور
طرفدار ہیں، فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے سہارا دیتا ہے۔

حکیم حسن اللہ خاں

ایک دن کچھ لوگ حکیم حسن اللہ خاں کو قتل کرنے کے لئے ان کے محل
پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند
آشفہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائی محبت
و بندہ پروری سے حکیم صاحب کو پہلے کے لئے، اپنے آپ کو ان پر گرا دیا۔ اس
طرح حکیم صاحب نے جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا
جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا (حکیم صاحب کا گھر جو خوبصورتی
و آرائش میں، رنگارنگ چمن کی طرح منظر کشی کیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ
لگا دی گئی۔ چھت کے شہتیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہو گئے۔ دیواریں سیاہ

پڑ گئی۔ گویا وہ محل اس علم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا ہے
 فریب مہر زگر دون نمود کا میں ہے مہر
 وہ فشار کسی را کہ در کنار کشد
 آسمان کی مہرانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ ہے وفاجی شخص
 کو آغوش محبت میں جاگہ دیتا ہے، اس کو کھمش و عذاب
 میں مبتلا کر دیتا ہے۔

برسے برا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا بشرطیکہ وہ
 والہیض نہ ہو۔ یہ غبیث ملک حرام جس کے منہ پر چھجک کے داغ ہیں بے حیائی
 کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے اپنے آپ
 کو زیور و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کو لیے مشکا تا ہوا انداز دکھانا ہوا
 گور تل ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تندر کو شرماتا ہے۔ میں نے
 اس کا نام اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدا زادہ گناہ ہے۔ میں اس پر لعنت
 بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا، اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

تفضل حسین خان

فوجیں ہر طرف سے آکر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا۔ اس
 وجہ سے دور دور کے سردارانِ فوج آٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نامور
 (مزار) تفضل حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے ملاقات نیا زمندی نہیں تھا
 دور ہی سے آستان شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مند قدیم لکھا۔

خان بہادر خان

خان بہادر خان نے جو گمراہ شہرت طلب تھے اور جو رہائی میں کچھ لشکر جمع
 کر کے سردار بن بیٹھا تھا۔ ایک سو ایک اشرفیاں تقریباً ساز و سامان سے آراستہ

نواب یوسف علی خان

چشم بدور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرماں روا کے دامپیر نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی کا حق ادا کر لیا ہے، اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتہ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

واقعات لکھنؤ

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں سے) رشتہ تعلق توڑ لیا (میشتر) انگریز (دشمن کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے۔ (لیکن فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر جلیں گارڈ میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادر محل کے ساتھ دروازے بند کر لئے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقعہ کار اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابان اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے۔ اس کم تعداد لیکن با شان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے وامبد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تخت حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شہنشاہ ہندوستان کا وزیر اؤ اپنے آپ کو پیش کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہمارے گھر کا قیام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا۔ ایک منتخب شخص کو منصب پیشکش کے ساتھ (دو ہاں) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا، دو روز آرام کیا پھر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبار قیام گھوڑے دو کوہ صفت

باتھی، ایک سواکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی، پوشی کی اور ایک جوڑا بازو بند جس میں میرے جڑے ہوئے تھے ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

پساری شان و شوکت روشنی چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی۔ گویا زمانے کی نظر بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومت اودھ کی اس پیشکش کے بعد آئینہ و سکندر اور جام حشید کی ساری داستان ختم ہو گئی (باجی) خوج کے شور و غل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ سچر منگ گئیں نہیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ آتن بلندی پر پہنچ گیا کہ دنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہو گیا۔

جائی کرستارہ شوخ چشمن در زد
افسر افسانہ دگر زن، رزان ار زد
خوش پدنا عیشہ ہار و گردش
بر چرخ نہ بینی کہ چنان می لوزد
جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے تو تاج
کی بھی کوئی قیمت نہیں رہتی تم نہیں دیکھتے کہ
تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا کانپتا ہے

۱۳ ستمبر

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پرورد فرمایا، اس کے کل کو پیر کے دن قری مہینے کی چوبیس ادا ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے من میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان و شوکوہ کے ساتھ، کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی رہی۔

مٹی گرز دہلی بروہن ہرود داد
ستمبر ہرود آورود داد

پس از چار ماہ و پس از چار روز
 فرزندانہ شد مہر گیتی منور
 ہتی گشت دہلی ز دیوانگان
 سہری گرفتند فرزندانگان

مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اٹھ گیا تھا تو
 ستمبر میں ظلم و ستم کا دور ختم ہو گیا اور انصاف کا
 زمانہ واپس آگیا چار مہینے چار دن کے بعد سورج
 آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے
 خالی ہو گئی مقل مند انگریزوں نے بہادری کے
 ساتھ اس پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ ۱۱ مئی سے ۱۲ ستمبر تک چار مہینے چار دن کا وقفہ ہے۔ لیکن اس
 بنا پر کہ پیر کے دن شہر انگریزوں کے ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر ہی کے دن
 قبضے میں آیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں
 آجانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاطمینہ نے راستے
 میں جس شخص کو ہایا قتل کر دیا شہر کے مالی خاندان اور صاحب عزت و آب و
 کی دولت کو بچانے کے لئے گھنٹوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بد باطن (دبا نیوں) کی جو فوج تھی اس میں سے کچھ لوگوں نے
 ساگ جلانے کی شان لی اور کچھ لوگوں نے عزت میں آکر لڑنے کی تیاری کی خبیث
 اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاطمینہ سے اٹھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں
 تو دشمنوں کو قتل کر رہے تھے۔

لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔

وہ تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدان
 جنگ بنے رہے دہلی دروازہ ترکمان دروازہ "اجیری دروازہ" یہ تینوں دروازے

اس نوح کے قبیلے میں رہ گئے مجھ مردہ دل کا سہم کدہ اسکان اوسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم

میں نے ابھی کہا کہ غضنک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سرو سامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکان کو جلاتا جا رہا تھا۔ ہاں جس مقام کو راکر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی سختیاں کی جاتی ہیں۔ اسی جھٹے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فق ہو گئے۔ جے شمار مرد عورتوں کے گردہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی۔ انے تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے، ان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں واپس آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔ میرے دل پر نہ خوف و نہ ہشمت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو خنش ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گناہگار تو ہوں نہیں کہ سنا پاؤں، انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا سازگار نہیں ہے مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بد خیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور ادھر ادھر سہاگنا بھردوں۔ (اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سرو سامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ (اس تہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ پھینکتے ہیں۔

پر تہی دستم دلی برگ نذر آتا چہند
بسن شاد و غم کاین گہرا ز کانہ مست

میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں
خداوند! کب تک یہ سوچ سوچ کر خوش
ہوتا رہوں گا کہ یہ جو اہر (کلام) میری
ہی کان کے ہیں۔

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قسمیں لکھی جا چکی ہیں ہر ایک
کو نوشتہ قسمت کے مطابق سروسامان عطا کیا گیا ہے مصیبتیں اور راحتیں
اسی حکم ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی سے جگہ کو چھوڑ کر جس طرح
بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت
افزائیر نیکیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھنا رہوں۔

۱۸۔ مقبرہ

تجدد کے دن محرم کی ۲۶ تا ۲۷ سنی اور مقبرہ کی ۱۸ دن چڑھے دنیا کو خوشی
بخشنے والا آفتاب عالم تاب برہنہ سفید کے ایک دیبے میں پہنچ کر کسوف میں
آگیا اور اہل عالم کی چشم جہاں میں پرتا رہی نے ظلم ڈھایا۔ گمراہ باغی اعدوں
و بیرون شہر سے خزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور غائبانہ شہر اور قلعے پر
قبضہ کر لیا۔ گشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس لمحے تک آگئی۔ خوف
سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

کوچے کی در بندی

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے (گلی
اندھے بندھے) گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ (اس گلی کے) زیادہ تر مہینے
والے بچے گئے ہیں (اس طرح کہ مورتیں بچوں کو چھاتی سے لگاتے ہوئے سٹیں لٹ
مردوں کے گاندھوں پر سامان کی گٹھڑیاں سٹیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے ہم

سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور پھر چن بیٹے، گلی سرستے
 تو سختی ہی۔ درستہ بھی ہو گئی۔ (ایک راستہ سٹھا وہ بھی بند ہو گیا)۔
 جاں اگر خستہ تراز تن بووم نیست شکست
 زان کہ دل تنگ تراز گوشه زندان منست
 میری روح جسم سے زیادہ حسرت و در ماندہ ہو تو تعجب
 کی بات نہیں، کیوں کہ میرا دل قید خانے کے گوشے
 سے بھی زیادہ تنگ ہے۔

مہاراجہ پٹیالہ کی مدد

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک
 مرتبہ مزید ختم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرما کر لائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریزوں)
 فاحشین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزوں کی شکست کی مدد گاہ ہے
 راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان
 کے نامور اور قابل عزت لوگوں میں سے ہیں (میری مراد) ہے حکیم محمود خان
 حکیم مرتضیٰ خان، حکیم غلام اللہ خان (اے) جو حکیم شریف خان جنت مکان کی
 اولاد میں ہیں۔ اس کو چھ برس پہلے ہیں۔ دوزخ ان کی درویشی و عمارتیں چلی
 گئی ہیں۔ میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ و ثروت کا بیٹا ہوں
 ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اول الذکر حکیم محمود خان مستعقین اور اہل
 نانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باحوریت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں
 حضرات پٹیالے میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ پہنچتے
 ہیں۔

چونکہ وہی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے ازراہ بندہ پروری طاقتور اور
 جنگجو (انگریزوں) سے ملے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہوگا اس گلی کے

دروازے پر محافظ مقرر کر دیئے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گوراکھتے ہیں گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

اٹھائے کلام میں کبھی کبھی (بھوڑا) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے اس معنی باتوں کے بعد (میں) پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سائے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکاندار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم قروش ہے کہ گیہوں خریدیں۔ نہ دھوئی ہے کہ کپڑے دھلنے کو دیں۔ بھام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور ہنر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صاف کتے بہر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ ان پانچ دلوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا لیکن اس کے بعد یہ صورتحال ختم ہو گئی (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر عزم دالم کا خبار چھپا گیا ہے

ہنگامہ گرم سازی کو خش بجا نمائد
نوں ہچناں بہ آتش سوزان برابر است
کوششوں کے سائے ہنگامے شندے پڑ گئے اب
مصیبتیں نوں کو آگ کی طرح ہلا رہی ہیں۔

پانی اور غلے کا قحط

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان متعارفہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوئی یا گھر سے ہیں ایک قطرہ نہیں رہا۔ خورتوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی جس کے ساتھ دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامان خورد و نوش حاصل کر لینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا دو شبانہ روز سب سہو کے پیلے لمبے ہے

فریاد ازاں زاری و خونابہ نشانی
فریاد ازاں خواری و لہرِ مگ نوانی
فریاد ہے چہارگی و خستہ درونی
فریاد ز آوارگی و بے سرو پائی

افسوس! یہ گریہ و زاری اور ذلت و محتاجی صد حیف!

یہ بے چہرگی و پریشانی حالی اور بے سرو سامانی؟

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، ہمارا جہ (پٹیل) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے پہنچنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے غور سے بھلت پائی: ہر چہ بادا باد "کہتے ہوئے پہرہ داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی، پہرہ اندازہ دوستی ستھانہ کہ ازراہ دشمنی۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جاسکتے ہیں چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پر خطر ہے۔

بھور و پریشانی حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ ہشتی یا مشک کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لئے ہر گھر سے ایک مزد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور اتنی (دور جا نہیں سکتے تھے۔ بھورا نیم شور پانی مشکوں اور گھڑلوں میں بھرا لئے اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بھی جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے۔ سپاہیوں نے کچھ رکالوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بوسے میں آٹا ملا نہ برتن میں روغن، میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے جو برتن، پیتلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے۔ ہمارے روزی تو ایسے (روزی رساں) کے ذمہ ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا خدا کی بخشش کا شکرنہ ادا کرنا شیطنت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی بات سُنے کو ملے۔ نہ خود باہر (جاسکتے) ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سائے واقعات دیکھیں یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور، اس کشمکش کے علاوہ نہ کھلنے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آگیا۔ پانی برسنا ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا جتنا ہے کہ بادل دریائے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس باریہ ہما صفت بادل پانی چشمہ حیوان سے لایا۔ گو یا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی۔ مجھ پر پاشاں مال نے وہ دولت (آبِ حیات) (اس) تباہی و بربادی کے عالم میں پائی ہے

غالب خود کو (ان) از دوست ہمانا

ز انسان و ہدم کام کہ بسیار مداحم

اے غالب! دوست کی طرف سے کہیں کو تاہی نہیں ہوتی۔

(البتہ) وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

سوانح غالب

اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور ماضی کے متعلق بھی لکھوں۔ اس طرح کہ یہ سرگزشت سلسلہ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پاٹھے۔

مرجم زدا بیخ تا زہ بزمِ جگر خم

پیکانِ دول بکاوشِ نشرِ برآدم

میں نے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرجم رکھ رہا ہوں اور
میں نشر کی مدد سے دل سے پیکان نکال رہا ہوں۔

اس سال میری زندگی کا باٹھواں ساں شروع ہوا۔ (اپنی مدت سے) میں اس دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعر و سخن میں مصروف جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خان بہادر کا انتقال ہو گیا خدا ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے، میرے چچا نصر اللہ بیگ خان بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے۔ موت کی گہری نیند سو گئے (گویا) میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائق تعریف و صاحب جاہ و جہت (بزرگ) چار سواروں کے سردار اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے۔ اس خانہ اور سخی سردار کی مہربانی سے وہ اگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے ان کے انتقال کے بعد وہ (دو نوں پرگنے) انگریزی حکومت نے واپس لے لئے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو میری تمام دیکھاؤں کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزانے سے میں نے حاصل کیا۔ میں نے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ (اب) میں بد نصیبی سے دو چار ہوں اور دل طرح طرح کے خیالات پریشان کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف وہی تھی نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی، تقریباً پانچ سال بچے کر میں نے اپنی بیوی (جو میری تنہا ہی کی ذمہ دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے بچوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زباں بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالم ہے چارگی میں (دو نوں بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریبان کے پھول ہیں۔

مرزا یوسف

بھائی جو در سال مجھ سے چھوٹا ہے تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو مستان کہے نہ شور و غل کرتا ہے اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کینیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے خاتمہ العقل مالک اور سائے سا مان کو ایک بوٹھے دربان اور ایک بڑھیا کینیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب سبھی (ان حالات میں) میں کس کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا، نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دو توں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں، روٹی اور پانی کی فکر ہے گی اور مرنے کے بعد کفن و دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (چوگام) اور رات میں کیسے سویا (چوگا) اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اساتے اٹھاتے مر گیا)۔

نہ ہمیں نالہ و فغان بلسم

من و جان آفریں کر جان بلسم

میرے چونتوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے

خدا کی قسم (اس غم سے) میں جاں بلب ہوں

جو حالات میں بیان کئے یہ حال دکھانے والے ہیں لیکن جو کچھ میں کہہ

نہیں سکا ہوں، وہ روح فرسلب ہے جو لوگ حالات سے واقف ہیں، اس سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غول سے نہیں گے اور شکر انصاف کمر بند گے۔

میں اس بڑھاپے میں چراغ صبح اور آفتاب لب بام کی مانند ہوں، میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا ردغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے وہی میرا حال ہے دو سال چوتھے کے میں نے ملکہ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم، ملکہ دکتوریہ کی مدد میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے براہ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آتے ہے ہنزہ پرور ماک نامور لارڈ الن براہادر کے حضور میں بھیجا جو گورنری کے زمانے میں ازراہ کرم میرے مرقی تھے۔

راہ سخن کشودم اگر خود نہ شد کہ بخت
راہم بہ بزم بالوسی گیتی ستان دہد

یہ شعر اسی قصیدہ کا ہے۔ وہ قصیدہ اسی ردیف قافیے میں ہے
کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین
پہینے بعد چانگ ایک مہلک قدم قاصد اس سرورستان سرور سے
(لارڈ الن براہادر) کا نوازش نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ ہنایت
محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس
کو ملکہ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے متعلقین بارگاہ شاہی کے
حوالے کر دیا۔ اس پر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن گزرنے
پہلے کہ سردار مہربان مسٹر رنڈنگھم براہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا
تھا کہ قصیدہ لارڈ الن براہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا۔

اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل مذاطلے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرما کر رو لئے ہندوستان کے دیلمے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

نائب کے تین مطالبات

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروفہ شہنشاہ انگلینڈ کے نام (ملکہ کر) سکندر چاہ فریدون حشم لارڈ کمیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس و آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ ”روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ مویوں سے منہ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا اور انعام دینا“ غرض مختلف اعزاز ہے ہیں۔ اس مداح کی یہ خواہش ہے کہ ملکہ معظمہ اپنی زبان مبارک سے مہر خواں (خطاب) ارشاد فرمائیں اپنے حکم سے سرا اور خلعت بخشیں اور اپنے خواں سے چند نان ریزہ (روٹی کے ٹکڑے) عنایت فرمائیں۔ اور مراپا کا ترجمہ حوی میں خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نان ریزہ کو انگریزوں میں پنشن کہہ سکتے ہیں۔

حاکم بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دل خندہ کو بشارتِ مداوے ارشاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستائش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبر مسرت سے میں ایسا مسرور ہوا کہ مجھے میں چھو لا نہیں سماتا تھا۔

مابلوس کن جواب

ہمارا ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمالی مالی نسب مسٹر سیل کلرک بہادر کے خواہر مشک بار کا لکھا ہوا مودت نامہ (موصول ہوا) اس (جواب) امید داری اور آرزو مندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (قدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاستوں عدالتیں نہ اُچڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا خرم و مسرور ہوتا جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دلوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔

اب وہ مبارک خطوط جو میری پرچوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش و خرد کے بازو کا تعویذ میرے پاس ہیں۔ اور جگر کے چند گونے جو چوش گر یہ ہیں آنکھوں سے ٹپکتے ہیں جگر خراشی و خون فشانی گلستان کے طور پر میرے دامن میں ہیں۔

فی کشتہ زخمِ نادرک و شمشیرِ م
فی خستہ ناخنِ پتنگ و شیرِ م
لب می گزم و خونِ بزبانِ می لیم
خونِ می خورم و ز زندگانی سیرِ م
میں تیرا تلواری کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پتنگ و شیر نے
مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدتِ غم میں) اپنے ہوش
کا شاہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں۔ خونِ جگر
کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔

مرزا یوسف کے گھر کی تارا جی

مقبور کی اکتیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے ستر ہوئے دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کوئے والے بھائی کے گھر میں چڑھ دوڑے۔ گلی اور گھر میں لوٹ مار کی، دلوانے مرزا یوسف خان اور دونوں بڑھیا کینیز (ماما) دلوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کو چے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے۔ اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ اگر کوئی سپاہی رحم کر تباہ یا دوسرا سختی کر تباہ ہے تو یہ ذاتی رحم دلی سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

انگریزی سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا اعتراف

• میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اہل اطاعت کو اس کو قتل نہ کیا جائے مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی۔ اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوڑھوں سورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر توسین خامدک گیا۔ اب میں ایک پُروردہ آواز بلند کروں کہ سمندرِ قلم قدم آگے بڑھئے۔ اسے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور ہتھار اول ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمن کی کوئی بنیاد اور مذاوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی ہے چادری عورتوں اور گھوڑوں میں کھیلنے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو جب دشمن کا بدلہ لینے کے لئے (مرنے والے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا۔ چوہدری دودھ) شہر والوں سے بھی برہم رخنے تو موقع تو اس کا تھا

کہ شہر و قباہیں ہونے کے بعد کتے، بلی، دھک کو (زندہ نہ چھوڑتے) لیکن انہوں نے ضبط کیا۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھر بار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہگاروں میں امتیاز نہیں جن لوگوں کو باز پرس کے لئے بلایا گیا ہے۔ ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے کچھ لوگ بہ دستور امید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو (لوگ شہر سے نکل کر) دیواروں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ابھی کوئی علم (صار) نہیں ہوا۔ جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں، ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے) اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر رہنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہونے کے لیے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جانتا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہیں یا باہر کے پریشان مال و سب کے لیے درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتل و غارت سے ہراساں ہیں۔

کرنل براؤن کے سامنے پیشی

۱۱ اکتوبر کا ہیرا کا معیت آخری دن تھا۔ دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملتی ہوئی ہے (وہاں سے) ایک بھتہ پر (اور چھت سے) کود کر گلیں میں آگئے۔ راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان گوروں نے) سچل منس سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو

تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فلائنگ سے
 کچھ فاصلے پر حقیقت پسند دانشور کرنل براؤن کے پاس ملے گئے جو چوک سے
 اس طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے (کرنل براؤن نے) مجھ
 بہت نرمی اور انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ
 پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر
 ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل براؤن) کی تعریف کی اور چلا آیا۔

۷ اکتوبر

۷ اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے (قوت) سامع کو نوازا
 اور آگہی کو حقیقت کو دیا (میں سوچنے لگا کہ) لفٹینٹ گورنر بہادر کے آنے
 پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور لواٹاب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر انیس
 توپوں کی۔ اکیس توپوں کی پوشش انفرادی سلامی کی کیا وجہ ہے دوسرے دن بھی نہ
 اس ناواقفیت میں کوئی کمی چوٹی نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا میرا خیال
 ہے کہ ملک کے بہت بلند کوہوار کرنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ
 باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح ہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور کھننویں
 جگہ جگہ فوجیں پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں، اور ان
 کے دل، کہ خدا کرے خون ہو جائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے کہ بیکار ہو جائیں
 اسی کام (لڑائی) کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

میواتیوں کی شورش

ادھر سو نہم اور لڑہ کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلایا
 رکھی ہے جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلامام نامی ایک شورش

پندر کچھ دن تک ریلواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتوں سے مل گیا یہ گروہ میڈلٹوں اور پہاڑوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آنکھوں اور ہر قسمی ہوئی آگ کے ہنگامہ بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے بے نئے کے ملاوہ کچھ دیکھا، تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بد نصیبی) کے ملاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطع نظر کہتے ہوئے (کہتا ہوں) کہ روزِ سیاہ (بد نصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

خانہ نشینی

جس دن گویے مجھے پکڑ مار لے گئے تھے۔ اس دن کے ملاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، لگن یا بازار میں چلنا، یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے گویا گنجہ کے دانشور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان میں کہا ہے ۔

دوام کہ گیتی چساں میسرود

چہ نیک و چہ بدور جہاں میرود

میں نہیں جانتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے ۔

کیا اجماعی ہو رہی ہے کیا برائی ۔

ان الاملاج غلوں اور سر ہم ہزار رنجوں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا

چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پرس کے لئے اٹھایا گیا اور جزلے اعمال بد کے

نیچے میں دوزخ کے کنوئیں میں ڈکادیا گیا ہے مجھ کو اس قید میں بے چارگی و

پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا ۔

آہ گر باشد ہمیں امروز من فردا میں
 مجھ پر جو کچھ آج گزر رہی ہے۔ اگر کل بھی یہی
 گزری (تو) آہ (کب ہوگا)

کیفیت روزنامہ شماری

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا ان حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزے
 ہیں یا ان واقعات (کا ذکر) ہو گا جو سُسنے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شدید حالات
 کیسے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنیں ہونگی یا کچھ کم کر کے
 لکھی ہوں گی۔ میں دادر گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سہائی میں بننا سکتا
 ڈھونڈتا ہوں آنکھیں بے کار ہیں، دل قیدِ (عزم) میں ہے اور لبِ سالک ہیں۔
 لوگوں کی زبانوں سے میرے کاؤں کو معلومات کی جھپٹک ملتی ہے کیسی بری ہے یہ
 گدائی! اور وہ بھی اس بے سرو پائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے جو کچھ نہیں لکھا
 (حالات ان واقعات کو) فتح شہر کی داستان کے دیباچہ کے طور پر (آغاز ہیں
 میں) لکھنا چاہیے تھا۔ اس کی بھی نہیں وجہ ہے کہ اس تحریک کے سلسلے میں میرا
 سارا سرمایہ سخن اپنے شدید ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً
 جب میں اس جہانے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں
 ادھر ادھر سے جمع کروں گا اور تب حقائق کاروں کی طرح یہ ماز کی بات لکھوں
 گا میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریک کے پڑھنے والے واقعات داستان کی تقدیم
 و تاخیر پر از روئے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ اکتوبر

۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے آتش

خشاں اتر دھے کی طرح دنیا کو بنگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کبوت دہان
 بھائی کے مرنے کی خوشخبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار رہا و فنا (یوسف مرزا)
 پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت
 ہو گیا۔ پانی، رومال، خصال، گورکن، اینٹ پھرتے، گائے وغیرہ کا ذکر چھوڑو، یہ
 بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت کو) کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد
 خاک کروں۔ بازار میں اچھا برا کسی قسم کا پٹر نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے
 والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے
 جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ تین شخصیں ساتھ ساتھ
 راستے سے گزریں۔ چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

مرزا یوسف کے کفن و دفن کا انتظام

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لئے
 تیار ہوئے پٹیلے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو لوگوں کو ساتھ لیا اور
 چل پڑے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید پادریں پہاں سے (گھر) لے گئے تھے
 ان میں پٹیا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی زمین کھودی۔ (قبر بنائی)
 میت کو اس میں رکھ دیا اور گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔

دریغ آں کہ اندر ورنگ مرعلیت

سہ وہ شادوسی سال شاد زلیت

تہ خاک بالیں رختش سن بود

خدا یا برہا مرد

خدا یا برہا مردہ بخشیش

کہ نادیدہ در زلیت آکیش

سروش بدل جونی ادفست

رعاشن بجا دیدہ میوز قست

اضحیٰ کے ساتھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال
 شاد رہا اور تیس سال کی ، قبر میں اس کو بالمش
 نخت بھی نہ ملا ، خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی
 قصت میں نہیں تھا ، لے فدا اس مرنے والے
 پدر جم کر کہ اس نے زندگی میں آرام (کی صورت)
 نہیں دیکھی ، اس کی دل جوئی کے لئے کسی فرشتے
 کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر۔

یہ نیک سرشت لیکن بد قصت شخص جس نے زندگی کے ساتھ سال خوش
 دوش گزائے۔ تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی
 دیوانگی کے عالم میں۔ زمانہ ہوش مندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالم دیوانگی
 میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا۔ ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۳ھ کی شب
 میں مر گیا۔

نساں مرگ بتم دیدہ مرزا یوسف
 کہ زلیتی بھیاں در ز خویش بیگانہ
 بچے در انجمن از من ہی بخرد ہش کرد
 کشیدم آہی و گفتم درین دیوانہ
 ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب مرزا یوسف کی تاریخ
 (وفات) پوچھی ، جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ
 ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا:
 "درین دیوانہ"

تاریخ وفات مرزا یوسف

واضح ہو کہ درین دیوانہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں مر گیا۔ اگر ان میں

سے ۲۰ آگے ۱۶ عدد نکال دیئے جائیں تو ۱۲۷۳ (ہجری) ثبت میں جو
مطلوب ہیں۔

بنام آنحضرت درخور اوست
بہر جامہ ضرود آری در اوست
اس خدا کے نام جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی
مناسب ہے۔ تم جہاں سر جھکاؤ گے، اس کا
آستانہ ہوگا۔

فرماں روا کی تباہی

جس ہفتہ انگریزی فوج نے شہر کا رخ کیا اس ہفتے ناموران دانش
مند امین الدین احمد خان بہادر محمد ضیا الدین خان بہادر نے حفظ وضع کی
خاطر اور امید بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بڑے بچوں کے علاوہ تین
ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ ہر گزٹ بہادر کا رخ کیا جو ان کی آبائی
جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور اس گورستان پر الوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔
دو تین روز آرام کی۔ اس دوران میں لیٹے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا جو کچے
پہنے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے البتہ ان تینوں
ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ سمجھا ہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال
لے گئے تھے۔ تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین
چلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ، لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر اس) بے سرو سامانی کے ساتھ
جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دو جان کی طرف روانہ ہو گئے۔
دو جان کے نامور اور نیک کردار (مزاں روا) حسن علی خان بہادر نے اذرا
نسایت و قیاض۔ (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی

کا گھر ہے۔ ان سب کو دوبارہ لے گئے۔

قتلہ منقر میر دار خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہم سر (مہالوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہ ایران نے جہالوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمتر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا دیکھ لوگ، شہر میں آئے اور حکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمتر نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوان خان سامانی کے پہلو میں شہر نے کا حکم دیا۔

تسلیم کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کے داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور وہیں میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے۔ نذر غارت گری ہوئے جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دو جانہ پہنچے اور جو سامان یہاں مملات میں خنساب لٹ گیا۔ بس انہیں پتھر باقی رہ گئے نہ سیم وزر محفوظ رہا نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) سے گناہوں پر رحم کرے اس آغازِ ناسازگار کا انجام بخیر ہو، اور (ان) کو مصیبت کے بعد آرام نصیب

حاکم جھمڑ اور حاکم فرخ نگر کی گرفتاری

یقیناً اکتوبر کی ۱۷ تاریخ تھی اور سپر کا دن کہ یہ دونوں دانش مندان بیٹھے شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد نوج کو حکم دیا گیا۔ نوج گئی اور جھمڑ کے حاکم عبدالرحمن کو بھرموں کی طرح لائی قلعہ کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوان عام کہتے ہیں (شہر نے کے لئے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔

۳۱، اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے جیسے عبدالرحمن خان کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک الگ جگہ ان کو شہر لایا گیا۔ فرخ نگر میں تیز دست تباہ کاروں کا نشان بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب لٹ گیا۔

حاکم بہادر گڑھ او بلب گڑھ کی گرفتاری

۴ نومبر کو پیر کے دن دہری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آ گئے اور قلعہ میں جہاں شہر لایا گیا شہرے۔ ۵ نومبر کو سینچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آ جانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے۔ ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ راجہ جو کہ دہلی کی اجنبی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جہر: بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دو جانا، پانڈی، ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا قلعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیر دار پانڈی اور دو جانا [خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔ دیکھو! ان کی جہاں بین آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں ہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باعزت لوگوں کی طرح چوکی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیئے اور صحرا زوری اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات، محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر ان (مملات والوانات کی) زمین کسی پیمائش کی جائے تو شہرہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو رقبہ ہوگا، اتنے بڑے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں ٹوٹ مار

دکرنے والوں کے ہاتھوں، صاف اور دیران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت لیکن سہاری سامان جیسے ایوان کے پرے، شامیانے، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا اچانک ایک رات، جس کی صبح کو راجہ ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس مکان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اٹھنے لگیں، ٹکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت مکان سے جانبِ مغرب اتنی قریب ہے کہ بھلا آدمی رات کو سمجھ سکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی کیونکہ اس وقت بچھیا ڈھل رہا تھا۔ راکھ میرے اوپر آرہی تھی۔ ہاں ہڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے) نئے سومات کی حیثیت رکھتے ہیں پھر ہڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برساتے۔

شاہ زادوں کی سرگزشت

راقم حالات کے علم کی جستجو (اس واقعے کے آخر سے) جو نیم مردہ چھوٹی کی رفتا کے برابر ہے (سست ہے)۔ (صفحہ کاغذ پر) اس حالت کی کیا ہو سکتی ہے کہ رنگا ہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہ زادوں کے متعلق اس سے زیادہ اوڈ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض کو گولی مار دی گئی۔ (اس طرح) موت کے اڑدھے نئے ان کو بھگایا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندہ ڈال دیا گیا (اس طرح) رسِ دار کی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھ کر رہ گئی۔ چند امیر و دل تپتے تھے ہیں اور بعض (عالمِ عزت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جاگیرداروں کا قتل

جھمبہ، ٹب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف دلوں

میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی بکے نہیں سکتا کہ خون بہا یا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء

جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو مزمان آزادی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے شہر کی طرٹ چل پڑے۔ خانماں بریلو مسلمانوں کے گھروں میں (غالی پڑا ہونے کے سبب سے) سبزہ اس قدر آگ آیا ہے کہ درودیلوار سبزہ ہیں۔ ہر لمحہ سبزہ سریلوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ بدستور، غالی ہے۔

حکیم محمود خان کے متعلقین کی گرفتاری

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ راجہ زندر سنگھ بہادر کے طبیعوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) سے ہودہ گوہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں موجود بھی ہوں۔ اس خیال سے ۱۲ فروری کو منگل کے دن حاکم شہر، کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے بالکون کو ساتھ دوسرے نیک دل پناہ گزیروں کے ساتھ پانے ہراوے گیا اگرچہ کوئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا؛ لیکن ہجرت لوگوں کی عورت کا بھی خیال تھا۔

۵ فروری

۵ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے بھتیجے عبدالکیم خاں حوت حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی ۱۲ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص ۱۲ فروری کو سنبھڑ کے دن تین شخص اور واپس

آگئے (لیکن) نصف سے زیادہ حالات میں رہ گئے۔ یہ معیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلگی میں برپا ہوا اس کی وجہ سے، مجددِ درویشِ حتم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس داروگیر میں مجدد سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سوتا ہوں۔

قصیدہ در مدح سر جان لارنس

فردی کے پر شوکت چہینے میں کہ اس زمانے سے ماہِ فردِ دیں تک (جو موسمِ بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رزق و روشنی بڑھ جاتی ہے سورج کو ابھی (مدحِ حملِ تک پہنچنے کے لئے) ایک چہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ حاکمِ مہراں، خورشیدِ طلعت، ستارہ ششمِ سر جان لارنس صاحبِ چیت کشر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں۔ ان کی مدح میں قصیدہ لکھا جائے۔ اس بناد پر اس والا شکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدمِ نوزد سے مشتمل تھا اور ۱۹ فردی کو جمعہ کے دن بذرِ یعدِ ڈاک بھیجا۔

۲۰۔ فردی۔ خبرِ فتح لکھنؤ

۲۰۔ فردی کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، ہنگ آہنگ لڑکوں کی آواز آئی اور انوار کی جگ کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوشخبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶۔ فردی کو آسمانِ سرودی کے اخیرِ تابندہ، سپہ سالارِ نامور کمانڈرِ انجیف بہادر نے سیاہ دھجگ جو (باجیوں) پر اس طرح چلیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مرزا) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعا مانگی کہ اس قدر تعریف کی

کہ اس کے ہونٹوں پر بیخالی پڑ گئے اور زبان خشک گئی۔
 دنیا کو آبادی کا مشرودہ اور اہل دنیا کو نذیر و آنا دی باکر آنا داور نیک ذات
 لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور ہڑے اور بد ذات لوگوں کا دور
 دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا سچر گھنٹے میں آیا کہ توپوں کی گرج (اور شہنائیوں
 کے نغمے) صرف (حصوں طاقت۔ غصے۔ فتح نصیب نوچ کے بہادر
 اس جنگ کے دوران میں شہر ہر قابض نہیں ہوئے بلکہ) دلہروں کے
 طرح دشمنوں سے لڑنے کے لئے دوپڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے
 بعد (لپٹے) پٹاڑی کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ فروری۔ آمد حیف کشنر

۲۴ فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے سے
 بوستان دارما آزاد مسرہ
 آسمان جاہ راتا بندہ ماہ

مہارک دقت میں باغ انصاف کے سرو آزاد آسمان
 رفعت کے ماہ تابندہ۔

فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ چشم، حیف کشنر بہادری نے اپنے توسن
 کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرف ستارہ زار بنایا
 اور تیرہ توپوں کی (سلاخی کی) آواز نے خستہ دلوں کو مرہم مہر و محبت کی بکھڑکی۔

درکابد شہر روان باز آمد

فرمانفر مالی شہر نشان باز آمد

زین شادی خوش دلی کہ داد شہر

گوئی مگر مگوشاہ جہاں باز آمد

حاکم شاہ نشان اکبیا، گئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں

روح واپس آگئی، شہر میں سرت کی ایسی دہر (پہر)
دور لگئی ہے جیسے (شہنشاہ) ہتھاہواں واپس آگئے ہوں۔

۲۷، فروری

۲۷، فروری کو جب سینچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی، رات کے تین
پہر گزر گئے (اس وقت) منظر موند کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا
گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اٹھے کہ چاند گہن میں آگیا۔ اسی سینچر کو حکم دو
باش ختم ہو گیا۔ انصاف چاہتے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے
کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

بے شمار لوگوں کو پھانسی

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندون شہر۔ اسے
دوڑوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے۔ (ان محدود مقامات میں کثرت
تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمایا جا رہا ہے۔ ان دوڑوں
قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دوڑوں میں پھانسی دے دی گئی ہے۔ ان
تعداد فرشتہ موت ہی بامقابلہ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں
پاؤ گے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں
ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے نہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی)
کے باشندے تھے ہی نہیں، بہت سے مالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دوڑ چار
چار کوس پر ٹیلوں، گرہوں، پھیروں کے مکاؤں میں اپنے نعیب کی طرح
آنکھیں بند کئے ہوئے پڑے ہیں۔ اس دیرانہ نشیں گروہ میں یا تو وہ لوگ
ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ ہیں یا
خیرات خوار یعنی پشٹن دار ہیں لوگوں کو بدخواستوں میں رہائی، آبادی اور

اجر لئے پنشن کے علاوہ اور کوئی مضمون) نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں، یہ انصاف طلب چشم براہ اور گوش ہرآواز ہیں کہ کیا صفحے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

۸ مارچ

میں بھی اس نیا زمانے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں جس کو میں نے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالات پریشاں کے سبب سے حاکم (شہر) کی جلتے قیام پر جلتے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے مقرر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا ہر طرف کانٹے ہی کلٹے ہیں۔ اگر باہر نکلے تو راستے میں (پچھے ہوئے) دیکھو گے، اگر گھر ہی میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے ہیں) (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک صبر بے تابی پر غالب تھا کہ ۱۸ مارچ کو پیر کے دن وہ خط ایک تقریر کے ساتھ میرے پاس واپس آ گیا۔ خط کی پیشانی حاکم دانش آموز کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط فریسنڈہ کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ حاکم شہر کے توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پر فائدہ جواب امید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری (گزارشات) منظور ہو جائیں گی وہ خط جس پر منظور تھا مناسب عمارت کے اضافے کے ساتھ سرور عادل رعایا پرورد دانش مند چارلس سائڈرس صاحب چیف کمشنر سپاڈ کے حضور میں بھیجا اور خط خاص طور پر نامور موسوٹ (چارلس سائڈرس) کے نام منسلک کر دیا جو خواہشی دیرینہ یعنی اجر لئے پنشن سے متعلق تھا۔

۷ مارچ

۷ مارچ کو بدھ کے دن مزاں رو کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے

یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہذیب کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سبھی سوچا کہ ایسے پر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش۔ میں تو بندہ شکم ہوں۔ مجھ کو تو روٹی چاہیے۔ دیکھوں اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ - فتح لکھنؤ

۱۸ مارچ کو جمع کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آواز توپ آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اٹھی (جس سے لکھنؤ کا فتح ہونا اس شہر میں کینہ خواہ انگریز فوج کا حب دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے باشندوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے، اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بناء پر جو شخص دیرماں رواؤں کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (استالی) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے دنیا والوں کے لئے مناسب ہے کہ جب لوگوں کو خدا نے خوش بخشی عطا کی ہے ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرما رواؤں کے حکم کی تعمیل کو خدا کے حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے۔ نغمہ طراز شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے

چہ کند بندہ کہ گزرت نہ بدست زمان را
چکند گونی کہ تن درند بد چو گان را
غلام آقا کے حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا اگر کیا
گنبد چو گان کی اطاعت کے علاوہ کچھ بھی کیا سکتی ہے

۲۲ مارچ سے مجھ دلوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں
فردوس کا مہینہ اور فردوس کا دن بھی تھا اور وہ روز جہاں اشرف (اور در) نہیں
دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ اس سال شاید یہ شہر مردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی
آمد آمد پر لغو ہائے مسرت سُننے میں نہیں آتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ: سال
کے سال درازہ گانہ میں سے کونسا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی
ساعت کب آئے گی۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر
کا روزنامہ ستر پیر (پیش گوئی شمار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے
والے کم ہو گئے اور یہ فرض کر لو کہ چند جھوٹی باتیں سنی ہی نہیں۔ آفتاب برج
حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ آگے اور پھول نہ کھلیں
اصول آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔ آسمان مقررہ اصول گردش کے خلاف حمل نہیں
کر سکتا۔

میں باغ پر نہیں چلنے اور آئسو بہا رہا ہوں مجھے موسم بہار کی کوئی شکایت
نہیں ہے۔ اپنی بد قسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں۔

جہاں از گل دلالہ پر بوی درنگ
من و گوشتہ و انہی زیر سنگ
بہار من ماند ہے برگ و ساز
دوخانہ از بے لوائے مسرا ز

دنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو
سے محط ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبور رہے سرو سامان

بیٹھا ہوا ہوں۔ یہاں کا موسم ہے اور میں بالکل بے سرو
سامان ہوں، مفلس کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔

روانگی محمود خان

میں دو تاجوں اور سو چٹا ہوں کر زما د بہت ہے پروا ہے۔ میں زلوے نشیں عم
و آلام اگر سبزہ دگل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو سچوں کی خوشبو سے معطر نہیں
کردں گا تو بہار میں کیا کی آجائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا ؟
اپریل کے چھینے میں جس میں دو ٹکٹ ماہ فروردین کے اور ایک ٹکٹ ماہ
اردی کا ہے۔ حکیم محمود خان کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے
ہر ایک نے اپنا راستہ لیا وہ تازہ چرودہ، صاف طینت (حکیم محمود خان) سائے
رشتے داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیلے کی طرف چلا گیا کہتے ہیں
ابھی تک وہ کرناں میں مقیم ہیں معلوم نہیں آئندہ کس لئے کیا سوچا ہے۔

فتح مراد آباد

مٹی کے شروع میں کالوں کو یہ خبر سننے کا خضر حاصل ہوا کہ سپاہ کینہ خواہ کے
بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا جو بداندیش (باہیوں) کی گزرگاہ ستھا اور اس
شہر کو انصاف سے آماتہ کرنے کے لئے عالی نسب مرچنڈہ علم و دانش، نواب یوسف
علی خان بہادر کے حوالہ کر دیا۔ نواب علی یوسف علی خان، جو دنیا کو فتح کرنے
اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں۔ اس علاقے پر تعمیل حکم کے طور پر فرمانروائی
کرتے ہیں (اور مجھ کو) امید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

فتح بریلی

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگات اور اثر حاشیہ کار فوج نے جب (بریلی

درواد (بادکے) اس علاقے پر پورش کی تو برہمنی کے گناہگار (باغیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا۔ جیسے طاقت ور موہیں جس و فاشاک کو کناہے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورتحال کو (دیکھتے ہوئے) توقع ہے کہ جو گراں جان (باغی) ادھر اُدھر باقی رہ گئے ہیں بشہدوں، لگاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستے چلنے والوں کو سستاتے ہیں ان کا دور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک ماکمان عادل (انگریز) کے پرچم کے زیر سایہ آجائے گا۔

۱۳ جون۔ احوال بہادر جنگ خان

۱۳ جون کو اتوار کے دن شام کے وقت ماکم شہر نے بہادر جنگ خان کو اپنے پاس بلایا جو قلعہ میں نظر بند تھے وہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ گئے۔ جان بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کئے جانے کی خوشخبری سنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بہر جوگی اور اسی شہر لاہور میں رہنا ہو گا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خان) جاہ و دولت کے غم و فاسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

فتح گو الیاء

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے اسی افق مشرق سے بہ قدر یک نیزہ بلند نہیں ہوا استقامت مارہ جون کے گزرنے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر عدد کی طرح گر جانے والی توپوں کی آواز بلند ہو گئی۔ (۲۱) ضرب توپ سے مراد ہے جس نے دوستوں کے دل کو مسرت و نشاط مانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (عم کی) راکھ و شمنوں کے سراؤں جہرے پڑا دی۔ گو الیاء کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعہ کے راستہ

آجائے گی خوشخبری جو زمین کا جگہ گوشہ اور پہاڑ کا تختہ جگہ ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مشرکہ پر مسرت نے) ماکوں اور فرا سے برداروں کو آندوں کے چراغ جل اٹھنے (آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت کی۔ یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں روا نے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں سے) امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی (باغیوں نے) بھاگ بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رخ کیا (ستھان) یہاں ایسی شکست فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گمراہوں کا انجام یہ ہو گا کہ بد حالی و بیز مردگی کے ساتھ ادھر ادھر لوٹ مار کرتے پھریں گے اور آخر کار جگہ جگہ ذلت و خواری کے ساتھ مائے جاں گئے ان کے صمراؤں و زرد گھوڑوں کو سہ آب و گیاه میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے ساز و سامان کو گزرگا ہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے پھر منڈستان خن و خار (نظم و نظم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ بارش کی طرح سرسبز ہو گا اور ہر گزربازار کی طرح پر رونق نظر آئے گی۔

واقم المردف کی زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرسائوں کے (سبب) سے ظاہر ہے کہ ابذلنے سے زیادہ فرصت (عمر) کی توقع ہے جا ہے محبوبنا سحر نگار شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دہراتا ہوں اور جس طرح ایک علم نصیب دوسرے غمزدہ شخص سے نصیبت حاصل کرتا ہے ان اشعار (کو پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قید و بند و غم سے آزاد تو کر ہی لوں گا۔

دریغ کہ بی مایوسی روزگار
بروید گل و بشکند تو بہار
بسی تیر و دیماہ وادی بہشت

بیاد کہ ما خاک، ہاشیم و خشت

افسوس ! ہمارے بغیر اس دنیا میں بار بار ہا بریں آئیں
گی اور سچول کھلیں گے۔ تیرے اور ار دی بہشت
کے مہینے بار بار آئیں گے۔ جبکہ ہم (قبر میں) خاک
ہو چکے ہوں گے۔

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے میں خیم
مسلمان مذہبی پابند یوں سے آزاد ہوں، اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے
بے نیاز۔ ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی
شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جبکہ انگریزی شراب
شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں۔ اگر خدا دوست،
خدا شناس، فیاض، دریا دل، ہمیش داس، دیسی شراب قند جو رنگ میں
ولایتی شراب کے برابر اور بڑے اس سے بڑھ کر ہے۔ بیچ کر آتش دل کو
سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا۔ اسی عالم جگہ نشینی میں مر جاتا ہے

از دیر و دم دایہ زہر در می جُست

از بادہ ناب ید و ساعری جُست

فرزادہ میں داس شغفید بمن

آئی کہ برای خود سکندر می جُست

موصے سے دل چاہتا تھا کہ کس طرح میری آرزو پوری ہو جائے

(آرزو یہ تھی کہ شراب ناب کے ایک دو ساغر مل جائیں

دانش مند ہمیشہ داس نے مجھ کو وہ آب حیات بخشی

دیا جس کو سکندر نے اپنے لئے ڈھونڈا تھا۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی پسند تھی (جیش داس)

نے (شہر میں) مسلمانوں کی آباد کاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ

خدا کی مرضی نہیں تھی۔ کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہرمان ماکوں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے بہر حال اس نیکی پسند بھی خواہ (میش و اس) کا اس مقام میں دخل پہلے۔ قصہ مختصر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے زندگی میش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے اگرچہ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں ہے اتفاقاً کہیں ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

ہندو شاگردوں اور دوستوں کی امداد کا اعتراف

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں میں سے ہر اس شخص، جو ایک نیک نام فوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (براہ راست ہے) اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے مالی نسب شیوہی رام برہمن، جو ایک عقل مند فوجوان ہے اور مجھ کو بچے کی طرح عزیز ہے مجھ و میش غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے فریاد داری اور کار سازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا رز کا بال ممکنہ جو ایک پرہیزگار اور خوش اخلاق فوجوان ہے اپنے والد کے طرح تعمیل حکم میں مستعد اور غم گساروں میں بچتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسان محبت کے اور کامل شیوا بیان ہر گopal تفسیر (بھی ہے) جو میرے پرانے مونس و ہمد ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں۔ ان کا کلام ساری خدا داد خوبیوں کے ساتھ میرے لئے سرمایہ نان ہے مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ مرنے پر محبت و اخلاص شاعرانہ سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم پھٹتے ہیں انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جز و روح سمجھ لیا ہے اور "مرزا قند" خطاب دیا ہے۔ انہوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی میرے پاس بھیجی۔

نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لئے لکھیں کہ ان لوگوں کی فیاضی اور محنت کا شکریہ ادا ہو جائے نیز اس لئے بھی لکھیں کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر سلاواڈ سے خالی ہے راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے روزن دھو بیٹھتے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے، ہر گھر میں مشناسا اور واقف کار موجود تھے۔ اس تہنائی میں تلم کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور (اپنے) کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔

اکتوں منہم کہ رنگ بردیم نیز سہ

تارخ بخون دیدہ نشویم ہزار بار

در ہیکم ز درد درینے است جان دل

در بستم ز غارۂ وفاراست پود و تار

اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب درنگ نہیں

آتا ہے جب تک کہ ہزار بار اشک دھوئے چہرے

کو تر نہ کروں، میرے جسم میں غم و افسوس جان و دل

نہ گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے

تیار ہوا ہے۔

گھر کی تباہی

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا، اگر دشمن، روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس ٹوٹ مار میں جبکہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی۔ اگرچہ میرا گھر ٹوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا، لیکن میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے

کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقیدہ و خوار کا حل اور اس دروغ نمائش کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں رہائشیوں نے شہر پر قبضہ کیا۔ بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زبردستی جو کچھ ستیا خانیہ طور پر کالے صاحب پرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پات دیا گیا۔

جب نتائج انگریزوں نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم لگایا۔ تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا وہاں تک جانے اور سامان لانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں۔ اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں

تنگ دستی و مجبوری

اب یہ جولائی کا پندرہواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے ملتی تھی اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں۔ میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب بیچ کر کھالوں گا، عالم برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا۔

اس قیامت میں پرانے فکروں میں سے دو تین لوگ میرے پاس سے نہیں گئے ان کی بھی ہمدوش کرنا ہے الفضا کی بات تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے بغیر نہیں سکتا۔ لوگوں کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس گروہ ملازمین کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ نانہہ اسٹال کے مادی ہیں۔ اس بڑے وقت میں بھی اپنی روح فرسا آواز (سوال) سے مرعہ کی صداٹے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اب جبکہ جسمانی تسکینوں کے دباؤ اور روحانی اذیتوں کی گڑبستی نے

جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے۔ یکایک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں جس کا نام تعریف ہے، کب تک مشغول رہا جاسکتا ہے یقیناً اس کش مکش کا انجام یا قوموت ہے یا سبک مانگنا پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لئے انجام و اعتنام سے محروم ہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

دوسری صورت میں یہ بات ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے سرباز اردھنکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جاسکتی ہیں اور اپنے آپ کو کہاں تک رسوا کیا جاسکتا ہے۔ باقی پشیم اگر مل گئی، تب سب آئینہ دل سے رنگِ عم صاف نہیں ہو سکے گا۔ قرض ادا نہیں ہوگا اگر نہیں ملے، اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہو جائے گا۔ (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں جو کچھ یہاں (دہلی) کی آب و ہوا محبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی ہے۔ یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

تفصیل و قانع دستبنو

مئی سال گزشتہ سے لے کر جولائی ۱۹۵۵ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ہمتیں خواہشوں میں خفقا غفلت اور پشیم کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز تخت سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس مختصر میں بھی کچھ لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے جہد نشان، مزیدوں فر کا دس مرتبہ شہر شکوہ، سکند و حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہِ روم سے بات کے لئے اس کا شکر گواہ ہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی

فرماں روانے روکس کا دال اس کی لشکر کشی کے خوف سے دو نیم ہے آفتاب
 اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے، اگر ڈرتا نہیں ہے
 تو پھر وہ کیوں ہر لمحہ کا پتلا رہتا ہے اور ماہِ کامل اس اندیشے سے کہ دنیا کو منور
 کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی نہیں چاہتا ہے تو
 پھر کیوں ہراتِ خوف سے گھٹتا رہتا ہے۔

خداوندِ تغیر و تحیج و نشان

شہنشاہِ مٹا ہوا وہ تہِ نشان

خردمندِ فرخ رُخ نیک خوئی

زلو شیریوں ہمدہ در داد گوئی

روخشاں و رخشی کہ جہیز داشت

ندانی کہ از بہرِ جُلُودِ داشت

بدان داشت تا اندرین روزگار

سپار و بدین نامور شہر یار

ز خسرو ترنج زرد ہنست گنج

رہ آورد شاہ است دست پنج

خود آں تخت کیش باو بردی بدش

بر شد پیش کیش کردہ "فروغِ سرودش"

نہ بینی کہ در کوہِ اذ مغر سنگ

بر آید ہی گو ہر رنگ رنگ

یو دمہر را چشم بر افش سرش

و گر نہ چہ کار است باگو ہر شش

گر آہنگ گو ہر نشان کند

چنان در نشانِ دال کند

کہ آں کو ہر آرد اگر در شمار
شود سودہ انگشت گوہر شمار

زیم سپاہش کہ گاہ نبرد
ہر آرد ز دریا و کہسار گورد
بگاہ اژدہا و بدریا جنگ
دہد جان در آب و زند سرسنگ

ز سر و مشکوہ نمایان او
خدیوان گیتی گدایان او
ہا فرزندش و بخشش ہے دین
در خشنود خورشید و بارندہ بین

ہر گشت بخشش خود دور لواز
بفرتاب دانش خرد مند ساز
بخشش شکر و بدانش رسا

جہاں دار فرزند و گنہور یا ؟
کہ پروان پاکش بگداز باد
از انگش دریں ہزم بسیار باد

(ترجمہ)

وہ مالک تیغ و گنیں و علم ہے، وہ شہنشاہ سلطنت بخش

اور بادشاہ ساز ہے۔

صاحب دانش، فرخ طلعت اور نیک شخص ہے۔ اس کا مرتبہ انصاف
میں تو خیر و ایں سے بلند تر ہے۔ جہتہ کے پاس جو درختاں علم تھا وہ
اس لئے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ ملکہ نامور کے سپرد کر دے۔
خسر و کی طرف سے ترنج زرا اور اس کے ساتوں خوانے بغیر رحمت

اٹھائے ہوئے ملکہ کو بطور تحفہ ملے۔

وہ تختِ سلیمان جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لے جاتی تھی، فرشتہٴ عیوب نے ملکہ کے سامنے بطور پیش کش پیش کیلیاں۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں پر پتھروں کے جگرے گوہرِ رنگا رنگ برآمد ہوتے ہیں۔ سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے ورنہ اسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی ٹٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں تو کثرتِ بخشش ہے۔ حالتِ ہوگی کہ اگر کوئی شخص اسے موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھس جائیں گی۔

اس کی خوج کے خوب سے جوڑائی کے دقت دریاؤں او پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ پہاڑوں میں اڑھے اور دریاؤں میں ہنگ سرنگ کر رہا ہیں گے۔

اس کی شانِ دشوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ اس کے دربار میں گدا ہیں۔

اس کی ضیاٴ بخشش اور کرم ہے دریخ کا یہ فیض ہے کہ یہ سولج رکشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم اور فیاضی سے اہل علم و دانش کو نوازیں دیتی ہیں اور ان کی دانشمندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحبِ خیر ہو جاتے ہیں۔ ان کی سخاوتِ حیرت آفریں ہے اور ان کی مقلدِ رسا۔ ان کا نام ملکہِ عالم و کشور ہے۔

خدائے پاک ان کا شہباز ہے خدا کرے اس مغل ہستی میں اُن کا قیام دیر تک ہے۔

اگر ملکہ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کروں گا تو دنیا
سے ماکام نہیں جاؤں گا۔

چوں نگارش بدیں نشان پیوست
تن ز دم ، داستان منی خواہم
جب بات یہاں تک آپہنچی تو میں خاموش ہو گیا
میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں ۔

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام دستنور رکھا گیا ، یہ کتاب لوگوں
کو دی گئی اور ادراد حرا و حرجی گئی تاکہ صاحبان علم و دانش کی روح کو شکین
بخشنے ۔ اور انشاء پر از انداز نگارش پر فریفتہ ہو جائیں ۔ امید ہے کہ
یہ مجموعہ دانش و دستنور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلہ سڑ پرنگ
دلو ہوگا ۔ اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند مینیں !

ز نیشان کہ چہ نشہ در روانی مایم
سرچشہ راز آسمانی مایم
لفق ز رساتیر بود نامہ ما
ساسان ششم بہ کاروانی مایم

جب بات یہاں تک رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے
کہ ہم راز ہلئے آسمانی کا سرچشہ ہیں ۔ یہ کتاب دستیر ہی
کا ایک حصہ ہے اس کاروانی کے لحاظ سے (گویا) ہم ساسان
ششم ہیں ۔

تمام شد

اس کتاب کو بغیر مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے
کا ارادہ نہ کریں ۔ فقط :

قطعہ تاریخ

آغاز کتاب از میرزا اعظم علی بیگ مہر خلیفہ سلمہ اللہ تعالیٰ

اسد اللہ منان غالب، مہر

حبذا زور تم چہ دستبنو

نامہ نمود سال خویش را و نشان

بیرہیناستم چہ دستبنو

۵۴ ع ۱۸

قطعہ تاریخ

انجام کتاب از میرزا لغت سلمہ اللہ تعالیٰ

کتابی ز درستم غالب کہ آں را

بہان و دل جہان گشت طالب

نو شتم لغت سال امتنا مش

بیا بستہ چہ دستبنو غالب

۵۸ ع ۱۸

لا ب دانش فطو و نفع عبادت معلوم

ہر دیک ساغر غفلت ہے چہ دینا و چہ نی

دیر و حرم آئینہ منجوار تہمتا

و اما ندگی شوق ترا شہ ہے چناہیں

تو، اور آرائشی حنم کا سن

یہ، اور اندیشہ ہائے دور و دراز

(غالب)